مجلس ادارت

۱- مولانا ابوالحسن علی ندوی ۲- ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳- مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۴- سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مرتب)

جلد ۱۲۶ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۵

مضامین

شذرات

معارف کے شذرات میں جہاں چودہ سو سال کے اندر کے بہت سے واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے، وہاں یہ بھی محاسبہ کرنا ہے کہ اس عرصہ میں مسلمانوں میں کتنے غدار پیدا ہوئے جن سے ملت میں ابتری پھیلی،

غداری کا سب سے بڑا واقعہ کربلا کا سانحہ ہے، کوفہ کے لوگوں کی دعوت پر امام حسین علیہ السّلام مدینہ منورہ سے روانہ ہو رہے تھے، تو ابن مطیع نے ان سے عرض کیا کہ خدا کے لئے کوفہ کا قصد نہ فرمائیں وہاں کے لوگ بڑے غدار ہیں، ان کے والد بزرگوار اور بھائی دونوں کو دھوکہ دے چکے ہیں، عراق کے لوگوں کا اصرار بڑھا تو امام حسینؑ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے کوفہ بھیجا، وہ وہاں پہونچے تو اٹھارہ ہزار کوفیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی، مگر جب انھوں نے عبید اللہ بن زیاد کے قصر امارت کو گھیر لیا، اور اس کی پسپائی یقینی تھی تو ان کے ساتھیوں نے ان کو چھوڑنا شروع کر دیا، اٹھارہ ہزار آدمیوں میں صرف تیس آدمی ساتھ رہ گئے، وہ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، اپنے قتل کئے جانے سے پہلے ابن اشعث کے ذریعہ سے امام حسینؑ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ان کے انجام کو دیکھ کر کوفہ والوں پر ہرگز اعتبار نہ کریں، مگر ابن اشعث یہ پیغام پہونچانے کے قبل ہی قتل کر دیئے گئے۔ عمرو بن عبدالرحمٰن اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ دونوں کو یقین تھا کہ جن لوگوں نے امام حسینؑ کو دعوت دی ہے، وہی ان کو جھٹلا کر بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے، یہی ہوا، امام حسینؑ حق و صداقت کی خاطر شہید ہوئے، اور اپنے خون سے کوفہ کی سرزمین کو شفق آلود اور لالہ زار کر دیا،

اموی فرمانروا عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو مغلوب کرنے میں خانہ کعبہ پر سنگ باری کر کے اسکو جو نقصان پہونچایا، وہ تاریخ اسلام کا ایک سنگین واقعہ ہے، جس کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ اسلام سے غداری ہی پر محمول کرنا صحیح ہوگا، گو عبدالملک نے اس کی عمارت درست کرائی، مگر اس کی جو بے حرمتی ہوئی اس کی تلافی نہیں ہو سکی،

بنو امیہ کے آخری دور میں ابو مسلم خراسانی کو بڑا عروج ہوا، وہ عجمی النسل اور پارسی نژاد نو مسلم تھا، اپنے عجمی تعصب میں عجمیوں کی حکومت کے خاتمہ کو بھولا نہ تھا، وہ عربوں سے اپنی نفرت میں ان سے انتقام لینے کی فکر میں رہتا، مگر بظاہر انکا دوست بنا رہا، بنو امیہ کے حامی قبیلوں میں سے مضریوں یمنیوں اور ربیعوں کو الگ الگ اپنی ہمدردی کا یقین دلاتا، مگر چپکے چپکے ان کے اختلاف کی آگ سلگاتا رہا، اس اختلاف میں انکے سر برآوردہ لوگوں کو قتل کرایا، پھر خود خراسان اور مرو پر قابض ہو گیا جس کے بعد امویوں اور عباسیوں کے اختلافات کو ایسی ہوا دی کہ عباسی امویوں سے برسر پیکار ہوئے تو ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مروایا، انکی نیم بسمل لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا، ان کی قبریں کھدوا کر ان کی خاک برباد کی، ہشام بن عبدالملک کی لاش سالم نکلی تو اسکو سولی پر لٹکا کر جلا دیا، اس طرح امویوں کو کربلا اور خانہ کعبہ کی سنگ باری کے سانحے کی سزا تو ضرور مل گئی، مگر عباسیوں نے انکے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا، وہ قرآن پاک کے اس حکم سے غداری تھی، جس میں یہ تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسی محبت والفت پیدا کر دی جو بڑے سے بڑا خزانہ صرف کر کے وہ حاصل نہیں کر سکتے تھے، (انفال ۸ - آیت ۶۳) بنو عباس اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح جانشین سمجھتے تھے، آپ نے فتح مکہ کے بعد اپنے شدید دشمنوں سے رواداری برتاؤ کی شاندار روایت قائم کی تھی، اس سے بنو عباس نے غداری کی،

اس قتل و خونریزی میں ابو مسلم خراسانی بھی ساتھ رہا، مورخین کا بیان ہے کہ اس نے چھ لاکھ

آدمیوں کا خون کیا اور اپنے کو عباسی حکومت کا بانی اعظم سمجھنے لگا، اس نے اپنی غدارانہ فطرت کی بنا پر منصور کے زمانہ میں بغاوت کرکے علوی حکومت قائم کرنے کا قصد کیا یہ عربوں سے انتقام لینے کا ایک اور بہانہ تھا منصور کو اسکی غداری کا صحیح اندازہ ہوا تو اس نے اس کو یہ کہہ کر قتل کرا دیا کہ خدا کی قسم روئے زمین پر اس سے زیادہ عباسیوں کا کوئی دشمن نہیں۔

عباسیوں کی پانچ سو برس کی حکومت کی مدت میں بہت سی بغاوتیں ہوتی رہیں، اگر کوئی بغاوت کسی حکمران کے ظلم کے خلاف ہوئی تو یہ حق بجانب تھی، مگر یہ بغاوتیں زیادہ تر ذاتی، نسلی، قبائلی، علاقائی اور فساد فی الارض کی خاطر ہوتی رہیں، ادریسی، طاہری، صفاری، اغلبی اور اسی طرح کی جو حکومتیں عباسیوں کے امپائر سے کٹ کر آزاد ہوتی گئیں وہ اب تک قائم رہتیں تو ان کی علحدگی میں کچھ جواز پیدا ہو جاتا مگر یہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ختم ہوتی گئیں، ان سے انکے علاقوں کو کچھ دنوں کے لیے تھوڑے فوائد تو ضرور پہونچے مگر ان کی علحدگی سے مسلمانوں کے ایک امپائر کی سالمیت، مرکزیت اور یکجہتی قربان ہوتی رہی، یہ علحدگی پسندی یقیناً غداری تھی۔

پھر یہ علاقائی حکومتیں ایک دوسرے سے خونریز جنگ کرکے ایک دوسرے کو تباہ کرتی رہیں مثلاً طاہریوں کو صفاریوں، آل بویہ کو سلجوقیوں، سامانیوں کو غزنویوں اور غزنویوں کو غوریوں نے ختم کیا، ان پر اسلامی اخوت کی قدروں سے غداری کا الزام نہیں آتا؟

صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے بود و نابود کا سوال تھا جب عماد الدین اتابک، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر اپنے صلیبی دشمنوں سے سربکف ہو کر لڑ رہے تھے، تو دمشق کا مسلمان جاگیردار عماد الدین کے خلاف عیسائیوں سے مل گیا، مسلمانوں کی مصری حکومت نور الدین کی مخالف ہو کر صلیبیوں کی حلیف بن گئی، اسی طرح موصل کے والی سیف الدین غازی، اسکے جانشین عز الدین، اسکے چچا زاد بھائی عماد الدین اور دمشق کے امرا، نے صلیبیوں سے مل کر صلاح الدین ایوبی کے خلاف سازش کی یہ سراسر اسلام سے غداری تھی، مگر اسلام کے جانباز اور سرفروش مجاہدوں نے ان غداروں کو زیر کر لیا۔

جب عباسی حکومت کمزور ہو رہی تھی تو شیعہ سنی کے اختلاف سے اور بے جان ہو گئی، اسکے آخری فرمانروا مستعصم پر اس کا شیعہ وزیر اعظم ابن علقمی حاوی تھا، وہ جو کہتا اسکو مستعصم صحیح مانتا، سیوطی کے بیان کے مطابق وہ پوشیدہ طور پر تاتاریوں سے ملا ہوا تھا، وہ عباسی حکومت کو تباہ کرکے علوی حکومت قائم کرنے کے بہانے سے اپنا ذاتی اقتدار چاہتا تھا، اسکی دعوت پر تاتاری بغداد پر

حملہ آور ہو گئے اور مستعصم بالکل غافل رہا، ابن خلدون کا بیان ہے کہ اس حملہ میں تمام مقتولین کی تعداد کا اندازہ سولہ لاکھ تھا ابن علقمی کی یہ غداری تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیگی، عباسیوں نے امویوں کو ختم کرنے میں جو سفاکی دکھائی تھی اس سے زیادہ انکا المناک انجام ہوا،

اندلس میں عرب اور بربر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو کر برابر لڑتے رہے یہ خانہ جنگی شاخ در شاخ عربوں کی قبائلی جنگ بن گئی، شامی اور یمنی بھی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے پہلے اندلس افریقہ کے ماتحت تھا اختلاف بڑھا تو بربروں نے افریقہ سے الگ ہو کر اندلس میں ایک آزاد حکومت قائم کر لی، خلیفہ ہشام نے بربروں کے استیصال کیلئے شامی لشکر بھیجا لیکن یہ شامی لشکری افریقہ کے قدیم باشندوں کے مخالف ہو کر انکے شدید دشمن ہو گئے اس اختلاف میں وہ بربریوں سے لڑے تو شکست کھا گئے، جس کے بعد بربری عربوں کو جہاں پاتے قتل کرتے خلیفہ عبد الملک نے ایک جرار شامی لشکر بھیج کر بربریوں کو شکست فاش دی جسکے بعد انکی قوت بالکل ختم ہو گئی مگر خود عبد لملک اور شامیوں میں اختلاف ہو گیا جس سے یمانیہ اور مضریہ میں ایسی خونریز جنگ ہوئی کہ مورخین کا بیان ہے کہ ایسی جنگ تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی، رفتہ رفتہ یمانیوں کا وہاں سے استیصال ہو گیا ان خانہ جنگیوں کی وجہ سے عیسائیوں کو موقع ملا اور الفانسو اندلس کے تقریباً چوتھائی حصہ کا مالک ہو گیا۔

اندلس میں مسلمانوں کی جو شاندار حکومت رہی اس پر غیر جانبدار یورپین مورخین بھی فخر کرتے ہیں مگر اس کا زوال وہاں کی نفاق پروری سے شروع ہوا، بنو حماد، بنو عباد، بنو ذو النون، بنو ہود، بنو عامر، بنو ذو القوی، المورد، اور بنو حمار وغیرہ اس چھوٹے سے علاقے میں اپنی اپنی علحدہ ریاستیں بنا کر آزاد ہو گئے، انکے انتشار سے عیسائیوں نے انکو آسانی سے مغلوب کرکے پورے اندلس کو ان سے خالی کرا لیا، یہ بربریہ، شامیہ، بنو حمودیہ، بنو عبادیہ، بنو ہودیہ، بنو عامر وغیرہ نے محض قبائلی اور نسلی مفاد کی خاطر اندلس کے مسلمانوں کی مرکزیت اور یکجہتی کو برباد کیا، انکو کیا کہا جا سکتا ہے خود غرض مفاد پرست غدار۔

عثمانی فرمانروا یورپ اور ایشیا میں پانچ سو برس تک حکومت کرتے رہے، اس مدت میں ایشیائے کوچک، شام اور مصر میں بغاوتیں ہوئیں انکی فوج میں ینی چیری کی شورش اور سرکشی ہوتی رہی، سیاسی فتنے بھی اٹھتے رہے، جن سے اسلامی قدروں کی پامالی ہوتی رہی مگر اسکی تاریخ کا دردناک واقعہ یہ بھی ہے کہ تیمور مسلمان تھا، مگر وہ سلطان بایزید جیسے جلیل القدر عثمانی

فرمانروا سے دو خونریز لڑائیاں سیواس اور انگورہ میں لڑا۔ سیواس کی لڑائی میں اس نے چار ہزار ارمنیوں کو زندہ دفن کرا دیا، سلطان بایزید کے لڑکے ارطغرل اور بقیہ ترک سپاہیوں کو قتل کرایا، انگورہ کی لڑائی میں سلطان بایزید نے اپنی فوج کی خود رہنمائی کی۔ اسکی فوج میں تاتاری سپاہی بھی تھے، جو میدان جنگ میں اس سے ٹوٹ کر تیمور کی فوج سے جا ملے اناطولیہ کی ترکی ریاستوں میں ایدین، منشا، صاروخان اور کرمیان کے دستے بھی عین موقع پر غدار ثابت ہوئے، اور وہ تیمور سے جا ملے سلطان بایزید اپنی سپہ گری اور سپہ سالاری کے پورے جوہر کے ساتھ لڑا، مگر شکست کھا کر تیمور کے ہاتھوں قید ہو گیا، اور قیدی کی حیثیت سے جان بحق ہوا، اسکے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی، تیمور کو کیا کہا جائیگا، فاتح کشور کشا یا مسلمانوں کی ایک شاندار سلطنت کو پامال کرنے والا غدار،

عثمانی سلطنت پھر سنبھلی تو سلطان سلیم اول کو ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی سے جنگ کرنی پڑی اس سلسلہ میں چالیس ہزار شیعے مارے گئے، سلیم شاہ اسمٰعیل صفوی کی فوج کو شکست دے کر تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا، یہ مسلمان فرمانروا جو آپس میں لڑے، ان میں سے دونوں نے اسلامی حمیت سے غداری کی مصر کے مملوک حکمراں قانصوہ غوری شاہ اسمٰعیل صفوی سے مل گیا، سلیم اول نے اس سے جنگ کی تو قانصوہ کے دو اہم فوجی سردار خیر بے اور غزالی غداری کر کے سلیم سے جا ملے اور وہ جنگ میں مارا گیا، اسکے جانشین طومان بے نے مملوکوں کے فوجی دستوں کو از سر نو ترتیب دے کر سلیم اول سے زمانیہ میں سخت جنگ کی جس میں پچیس ہزار مملوک سوار مارے گئے، فتح سلیم اول کو ہوئی وہ قاہرہ میں داخل ہوا، تو اس نے پچاس ہزار آدمیوں کا قتل عام کرایا، ایک مملوک سردار فرط بے گرفتار ہو کر اس کے سامنے آیا تو اس نے خیر بے کو دیکھ کر سلیم اول سے کہا کہ اس غدار کا سر اڑا دے ورنہ کہیں تجھے بھی یہ اپنے ساتھ جہنم میں گھسیٹ نہ لے جائے اور جب سلیم اول کے حکم سے فرط بے کا سر قلم ہونے لگا تو اس نے خیر بے کی طرف متوجہ ہو کر کہا اے غدار میرے خون آلود سر کو لے جا اور اپنی بیوی کی گود میں ڈال دے خدا غدار کو اس کے فعل کا ویسا ہی بدلہ دے۔

مصر دولت عثمانیہ کے قلمرو میں رہ کر رفتہ رفتہ خود مختاری حاصل کرتا رہا لیکن انیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں نہر سویز تعمیر ہونے لگی تو مصر کے والی اسمٰعیل پاشا نے خدیو مصر کا لقب اختیار کر کے ترکوں سے غداری کی انگلستان اور فرانس کو نہر سویز کا حصہ دار بنا لیا، جس سے مصر ان دونوں ملکوں کے پاس گویا گروی ہو گیا، مصری فوج کو یہ پسند نہ آیا، اس نے اعرابی پاشا کی رہنمائی میں بغاوت کی تو اسمٰعیل پاشا کو معزول ہونا پڑا لیکن جب اسکا جانشین توفیق پاشا ہوا تو وہ غداری کر کے انگریزوں سے مل گیا، اس نے اعرابی پاشا کے بہت سے فوجی افسروں کو رشوتیں دے کر اس سے غداری کرنے پر آمادہ کیا، ان ہی غداروں کی مدد سے انگریزوں نے اعرابی پاشا کو پکڑ کر لنکا جلا وطن کر دیا جس کے بعد توفیق پاشا نے برطانوی سنگینوں کے سایہ میں مصر کی حکومت حاصل کی۔

پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے ٹرکش امپائر کے خلاف عرب قومیت کا جذبہ ابھارا، لارڈ کچنر نے شریف حسین بن علی کو اس کے لڑکے امیر عبداللہ کے ذریعہ سے یہ پیام دیا کہ اگر وہ ترکوں کے خلاف اتحادیوں کا ساتھ دے تو اسکو حجاز کا خود مختار حکمران تسلیم کر لیا جائیگا، وہ اس غداری کے لئے تیار ہو گیا، لارڈ کچنر نے سامان جنگ خفیہ طور پر اس کے پاس بھیجا تو اس نے حجاز کی آزادی کا اعلان کر دیا، رشوتیں دے دے کر اس کے لڑکے امیر فیصل نے شام اور فلسطین کے عرب قبائل کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا، ٹی، بی۔ لارنس نے اس غداری کو خوب ہوا دی، ترکوں کی لاشوں پر شریف حسین کو حجاز کا خود مختار حکمران بنایا گیا، انگریزی فوج کے سایہ میں امیر فیصل دمشق میں داخل ہوا، اس غداری پر دنیا کے سارے مسلمان تلملا اٹھے تو اقبال نے اپنے دل کے پھپھولے ایک نظم لکھ کر توڑے جس کا ایک شعر یہ تھا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ   خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

غداروں کے ساتھ غداری کرنا آسان ہوتا ہے، اس جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے عربوں سے آنکھیں پھیر لیں، فرانسیسیوں نے دمشق پر قبضہ کر لیا، انگریز عراق اور فلسطین پر قابض ہو گئے، فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا اعلان کر دیا، شریف حسین نے اپنے لڑکے امیر عبداللہ کے ذریعہ سے مداخلت کرنی چاہی تو امیر عبداللہ کو اتحادیوں نے اردن کی بادشاہت دے کر باپ سے توڑ لیا، اس افراتفری میں حجاز کے باشندوں کی زندگی اجیرن ہونے لگی، تو اشراف مکہ نے نجد کے فرمانروا سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو حجاز پر لشکر کشی کی دعوت دی، شریف حسین نے انگریزوں سے مدد چاہی تو انھوں نے غیر جانبداری کا

عذر پیش کیا، شریف حسین نے حجاز سے فرار ہو کر قبرص میں پناہ لی۔

عربوں کی بے وفائی سے غضبناک ہو کر مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں خلافت ختم کر دی، اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینے سے انکار کیا، عربی رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط اختیار کرنے کا حکم دیا، بعض مسجدیں میوزیم بنا دی گئیں، مصطفیٰ کمال اگر عربوں سے خفا تھے، تو اسلام پر تیشہ زنی کی کوئی وجہ نہ تھی، ان کی اس خفگی کو اسلام سے غداری ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

عربوں کی عرب قومیت کام نہیں آرہی ہے، اسی قومیت کے سہارے ان کی بہت سی ریاستیں قائم ہو گئی ہیں، مگر وہ راکھ کے ڈھیر ہیں لاکھوں فلسطینی عرب بے خانماں برباد ہو کر در بدر مارے پھر رہے ہیں، کبھی اردن ان کو خونی غسل دیتا ہے، کبھی شام ان کے ٹھکانوں پر بمباری کرتا ہے، یہودی تو انکا قصائی بنا ہوا ہے، ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے عربوں کو جو ذلت آمیز شکست دی ہے، وہ مسلمانوں کی تاریخ میں بھلائی نہیں جا سکتی، یہودیوں سے دوسری جنگ کے بعد مصر تمام عرب ممالک سے کٹ کر یہودیوں کا حلیف بن گیا ہے اور یہ تمام عربوں کی نظر میں غدار ہے،

شام، عراق، شمالی یمن اور اب افغانستان کے حکمراں اسلام سے غداری کر کے طرح طرح کے غیر اسلامی نظریوں کے قائل ہو گئے ہیں، ترکی کی فوج کو بھی اسلام پر بھروسہ نہیں، مگر ان سبھوں نے اسلام کو کھو کر کیا پایا، عربوں نے اسلام کا نام لے کر حکومت کی تو انھوں نے ایک ایسا امپائر قائم کیا جسکی مسافت بقول ڈیڈرو گبن دو سو دن میں طے ہوتی تھی، عثمانیوں نے اسلام ہی کے نام پر اپنا ٹرکش امپائر بنایا تو انھوں نے رومن امپائر، زار روس اور نپولین سے کامیاب ٹکر لی، محمود غزنوی نے اسلام ہی کا نام لیکر اپنے زمانہ میں ایک افغان امپائر بنا لیا تھا، لیکن آج جب قومیت کے نام پر علاقائی حکومتیں بن رہی ہیں تو دنیا میں ان کی کیا حیثیت رہ گئی ہے، انگلبر فرمانروا امریکہ اور روس کے سہارے زبان حال سے یہ کہہ کر جی رہا ہے،

تیری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

معارف کے آئندہ شذرات میں کچھ اور غداروں کی روداد ہوگی۔

مقالات

فاتح علم

از جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش،

(۳)

فاضل تبصرہ نگار کے تبصرے سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جو بھی وجہ رہی ہو، مصنف نے برصغیر (پاک و ہند) کے فضلاء کی تحقیقات سے اپنی فاضلانہ پیش کش میں کوئی تعرض نہیں کیا، حسب تصریح تبصرہ نگار انھوں نے فراہمی مواد کے سلسلے میں مہینوں ترکی اور مصر میں قیام کیا ہے، مگر کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ انھوں نے اس سلسلے میں ہندوستان کو درخور اعتنا یا یہاں کے فضلاء کی تحقیقات کو لائق التفات سمجھا ہو، مثلاً حسب تصریح تبصرہ نگار "باب دوم (میں) ...... | "خدائی علم کا مسئلہ" (مسئلہ علم واجب)

انسانی علم اور خدائی علم کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے"، انسانی علم سے متعلق ابحاث تو علم کلام کی مطولات میں تمہیدی مقدمات کے طور پر بیان ہوتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال "شرح المواقف" ہے، جس کی ابحاث متعلقہ "علمیات" کا خلاصہ سابق میں دیا جا چکا ہے۔

خدائی علم کی بحث یا "مسئلہ علم واجب" اسلامی فکر کا ایک اہم مسئلہ ہے جو صفات باری تعالیٰ کے ضمن میں بلا کسی استثناء کے علم کلام کی ہر کتاب میں بیان ہوتا رہا ہے، متکلمین کے علاوہ حکماء و ارباب تصوف نے بھی اسے درخور بحث سمجھا ہے، امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں، امام رازی نے المحصل اور المباحث المشرقیہ میں، قاضی ناصر الدین بیضاوی نے "طوالع الانوار" میں، قاضی عضد الدین ایجی نے

"المواقف فی الکلام" اور "عقائد عضدی" میں، علامہ تفتازانی نے "شرح مقاصد" اور تہذیب الکلام میں، شیخ بوعلی سینا نے "شفا" اور "الاشارات" میں "شہاب الدین سہروردی مقتول نے "حکمۃ الاشراق" اور "ہیاکل النور" میں محقق طوسی نے تجرید اور شرح الاشارات" میں شیخ ابن عربی نے فتوحات مکیہ اور نصوص الحکم میں۔ اسی طرح متاخر مفکرین (جیسے محقق دوانی نے حواشی شرح تجرید میں میر باقر داماد نے الافق المبین میں صدرائے شیرازی نے حواشی شفا" اور "الاسفار الاربعہ میں، اس مسئلہ کی مختلف حیثیتوں کو اپنی تفکیری ورزش کا موضوع بنایا ہے،

"خدائی علم" یا "علم باری تعالیٰ" کی بحث دو ذیلی ابحاث میں تقسیم کی جاتی ہے۔

بحث اول:۔ باری تعالیٰ کے لئے صفت علم کا اثبات۔

بحث دوم:۔ علم باری تعالیٰ کا عموم

جہاں تک باری تعالیٰ کے لیے صفت علم کے اثبات کا تعلق ہے، نفس مسئلہ متکلمین اور حکماء کے درمیان متفق علیہ رہا ہے، دونوں اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم کو ثابت کرتے ہیں، اگرچہ دونوں کے مناہج علحدہ ہیں۔ سب سے زیادہ معرکۃ الآراء مسئلہ دوسرا ہے، یعنی آیا باری تعالیٰ کو جزئیات مادیہ متغیرہ کا بھی علم ہے یا نہیں۔ متکلمین کہتے ہیں کہ "ہے"، اور حکماء اس کے منکر ہیں، وہ صرف اس بات کے قائل ہیں کہ واجب تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے، اس اختلاف کی مزید وضاحت سے پیشتر دونوں کے فکری پس منظر پہ ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

یونانی اسلامی فلسفہ کا بانی و واضع اور معلم اول ارسطو ہے، ارسطو سے پہلے فلسفہ کے آغاز وارتقا کی تفصیل غیر ضروری ہے، مگر ارسطو کے یہاں بھی باری تعالیٰ کا تصور واجبی واجبی ہی سا ہے، اسے اپنے تجویز کردہ نظام کائنات کے لئے ایک "محرک اول" کی ضرورت تھی اور وہ اس نے اس تصور سے پوری کرلی جس کی اہمیت ایک مقدس مفروضہ سے زیادہ نہیں ہے، لہٰذا اس کے یہاں اس

تصور باری تعالیٰ" میں علم اور دیگر صفات کی تلاش بیکار ہے بقول حافظ ابن تیمیہ

فارسطو واتباعہ لیس فی کلامھم	ارسطو اور اس کے متبعین کے یہاں نہ
ذکر واجب الوجود ولا شئی	تو واجب الوجود کا ذکر ہے اور نہ ان احکام کا
من الاحکام التی لواجب الوجود	جو واجب الوجود کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں،
وانما یذکرون العلۃ الاولیٰ	فلاسفۂ متقدمین تو صرف علت اولیٰ ہی
(الرد علی المنطقیین صفحہ ۱۴۴-۱۴۳)	کا ذکر کرتے ہیں۔

اور حافظ ابن تیمیہ کے اس تبصرہ کی تائید اس کی "مابعد الطبعیات" سے کی جاسکتی ہے۔

لیکن باری تعالیٰ کا ایسا تصور جو جملہ صفات کمالیہ سے متصف اور تمام سمات نقص وحدوث سے پاک اور منزہ ہو فطرت سلیمہ کا ایک ناگزیر تقاضا ہے، اور انجام کار متاخر یونانی فکر کو بھی اس تقاضے کو پورا کرنا پڑا، چنانچہ پروفیسر تھلی ان متاخر فلاسفہ کے بارے میں لکھتا ہے،

"کچھ طبائع کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کائنات کو مسلمات کا ایک میکانکی بازیچہ سمجھ لیں اور خلاق کائنات کے بارے میں تلاش وتجسس کے اس جذبہ کو دبائے رکھیں جو ان کے اعماق قلب میں بار بار تڑپ رہا تھا..... تشکیکین کی تشکیک کے باوجود وہ عرفان الٰہی کی آرزو کا استیصال نہ کرسکے"

مگر نوفلاطونی فلاسفہ نے جو ایک جانب افلاطون وارسطو کے فکری ورثہ کے امین تھے اور دوسری جانب قیاصرۂ روم کے زلہ ربا، دونوں کے درمیان ایک ادنے پونے کا سمجھوتا کرڈالا انھوں نے مثبت حقائق انھوں نے قیصر کے حصہ میں رکھے اور دل خوش کن منفی لطائف الٰہ العالمین کے حصہ میں دیئے"

چنانچہ پروفیسر تھلی اس جماعت کے سربراہ فلاطینوس کے بارے میں لکھتا ہے،

"اس کے نزدیک الٰہ العالمین اس قدر ورار الورار ہے کہ ہم جو کچھ بھی اسکے بارے میں

کہتے ہیں اُس سے اسکی تجدید ہو جاتی ہے، لہذا ہم اس کی طرف جہال، خیر یا علم کسی صفت کا انتساب نہیں کر سکتے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کیا نہیں ہے ...... ہم اس کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ تعقل کر رہا ہے، کیونکہ یہ تصور عاقل و معقول دو تصوروں کو متضمن ہے حتی کہ عالم بالذات شئی بھی جو اپنی ذات کا تعقل کرتی ہے خود کو فاعل اور مفعول کی دوئی میں بانٹ دیتی ہے، یہ کہنا کہ خدا جانتا ہے یا ارادہ کرتا ہے، اُسے اُس چیز سے جو وہ جانتا ہے یا جس کا وہ ارادہ کرتا ہے محدود کر دیتا ہے"

اسی طرح ان فلاسفہ کے یہاں ذات باری تعالیٰ کے باب مین تنزیہ مفرط نے تعطیل کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی، لہذا سنہ مسیحی کی ابتدا کے بعد بالخصوص الہامی مذاہب کے پیشواؤں سے تاثر کے بعد انھوں نے غور و خوض کر کے باری تعالیٰ کی صفت علم میں نئی نئی جدتیں پیدا کیں۔ ایک بیدار مغز بادشاہ کی طرح امور مملکت کی جزئیات سے باخبر ہونا اُس کی شان عالی کے شایان نہیں ہے اُسے تو ایک آئینی سربراہ مملکت کی طرح صرف کلیات اُمور سے واقف ہونا چاہئے۔

اس طرح واجب تعالیٰ کا علم کلیات تک محدود رکھا گیا، اور یہی فکری سرمایہ بعد میں حکمائے اسلام مین منتقل ہوا۔

ادھر اسلام نے مبعوث ہو کر ایک مکمل دین قویم کی بنیاد ڈالی جو انسان کی فطرت خدا جوئی کی تشفی کے ساتھ ساتھ نظام عالم میں نظم و ضبط قائم رکھنا بھی چاہتا تھا، چونکہ محض قانون کا خوف یا رائے عامہ کی پروا بدکاروں کو ان کی بدکاری سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ایک موثر روک کے لیے اُن کے اذہان میں ایک ایسی ہستی کا غیر متزلزل یقین (ایمان) پیدا کرنا ناگزیر ہے جو نہ صرف ان کے جزئیات اعمال بلکہ انکے قلوب میں پیدا ہونے والے ہر خیال و گمان سے بھی علی وجہ الکمال باخبر ہو۔ بالفاظ دیگر ایک علام الغیوب پروردگار عالم پر ایمان اسلام کی تعلیم کا رکن رکین قرار دیا گیا، قرآن کریم بار بار اس حقیقت نفس الامری

کو مومنین کے ذہن مین راسخ کرتا ہے، تفصیل آگے آرہی ہے،

اس طرح باری تعالیٰ کے جزئیات مادیہ حادثہ کے عالم ہونے پر ایمان و ایقان دین اسلام کی بنیادی تعلیم کا جزو لاینفک بن گیا، جس سے صرف نظر تو درکنار اس میں تساہل بھی منافی دین بلکہ کفر بواح سمجھا گیا۔

بہرحال بقول علامہ تفتازانی جب یونانی فلسفہ مسلمانوں مین منتقل ہوا تو جن امور میں وہ اسلامی تعلیمات سے متصادم تھا، متکلمین نے اُن کے رد و ابطال پر کمر باندھی، انھیں متنازع فیہا مسائل میں (جن کے اندر اسلام اور فلسفہ میں کسی قسم کا سمجھوتا ناممکن تھا) عموم علم باری تعالیٰ کا مسئلہ بھی تھا، اسلام کی تعلیم تھی۔

"ان اللہ بکل شئی علیم" (عنکبوت ۶۲) ان اللہ بما کنتم تعملون" (نحل ۲۸) یعلم ما فی السمٰوات والارض (عنکبوت ۵۲)

"یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو الرحیم الغفور" (سبا ۳۰)

"ان اللہ عالم غیب السمٰوات والارض انہ علیم بذات الصدور" (فاطر ۳۸)

"عالم الغیب لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السمٰوات ولا فی الارض ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین" (سبا ۳)

"یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور" (مومن ۱۹)

اور فلسفہ صرف اتنا ہی تسلیم کرتا تھا، کہ اول (باری تعالیٰ) صرف کلیات کا عالم ہے، اور اگر جزئیات کے علم کا سوال ناگزیر ہو ہی جاتا تو وہ بر سبیل تنزل کہتا کہ اُسے جزئیات متغیرہ کا علم محض علی وجہ الکلی ہے، اس طرح علم باری تعالیٰ بجزئیات متغیرہ کا مسئلہ ان معرکۃ الآراء مسائل میں خصوصی اہمیت کا

حال بن گیا جن کے اندر، جیسا کہ سابق میں مذکور ہوا، شریعتِ اسلامیہ اور یونانی فلسفہ میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اور جس سے انکار بقول امام غزالی رحمہ اللہ کھلا ہوا کفر ہے، چنانچہ وہ تہافت الفلاسفہ کے خاتمہ میں فرماتے ہیں۔

قلنا تکفیرهم لابد فی ثلث مسائل احدها مسئلة قدم العالم وقولهم ان الجواهر کلها قدیمة والثانیة قولهم ان الله تعالی لایحیط علماً بالجزئیات الحادثة من الاشخاص، والثالثة فی انکار بعث الاجساد وحشرها فهذه المسائل الثلاث لا تلائم الاسلام بوجه ومعتقدها معتقد کذب الانبیاء ..... وهذا هو الکفر الصریح۔

ہم کہتے ہیں کہ تین مسئلوں میں اُن کی (فلاسفہ کی) تکفیر ناگزیر ہے، اول قدم عالم کا مسئلہ اور فلاسفہ کا یہ کہنا کہ جواہر سب کے سب قدیم ہیں، دوم فلاسفہ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا علم جزئیات حادثہ کو محیط نہیں ہے، اور سوم فلاسفہ کا بعث بعد الموت اور حشر اجساد کا انکار، پس یہ تین مسئلے کسی طرح بھی اسلام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اور ان کا اعتقاد رکھنے والا انبیاء علیہم السلام کے جھوٹ کا معتقد ہے، ..... اور یہ صریح کفر ہے،

چنانچہ امام غزالیؒ نے تہافت الفلاسفہ" کے تیرھویں مسئلہ

" مسئلة فی ابطال قولهم ان الله تعالی عن قولهم لایعلم الجزئیات المنقسمة بانقسام الزمان الی الآن والی ماکان وما یکون "

کے اندر فلاسفہ کے اس قول کا کہ "اللہ تعالیٰ کو جزئیات حادثہ متغیرہ کا علم نہیں ہوتا" رد کیا ہے،

امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ" کا ابن رشد اندلسی نے جو یورپ میں "[illegible]" کے نام سے مشہور ہے تہافت التہافت کے نام سے رد لکھا اور اس کے بعد دونوں کتابوں میں مذکور مسائل حکمار و متکلمین کے درمیان گرمی بحث و مناظرہ کا موضوع بن گئے۔

ترک سلطان محمد فاتح، جو تاریخ میں قسطنطنیہ کے فاتح کی حیثیت سے مشہور ہے، علم و حکمت کا بھی بڑا سرپرست تھا، اُس نے دربار کے دو عالموں خواجہ زادہ اور علاء الدین طوسی سے ان دونوں کتابوں (یا حکمار و متکلمین) کے درمیان محاکمہ کرنے کی فرمائش کی، اول الذکر نے یہ محاکمہ تہافت الفلاسفہ کے اور ثانی الذکر نے "کتاب الذخیرہ" کے نام سے مرتب کیا۔

بظاہر بحث ختم ہوگئی، مگر نہ حکمار کے عقیدت مندوں نے ہمت ہاری اور نہ متکلمین کے پیرووں نے اور خصوصیت سے متنازع فیہا مسائل ثلاثہ کے باب میں نئی نئی توجیہات پیش کیں، بالخصوص ایران میں جہاں شیخ بو علی سینا (جس پر براہ راست ان مسائل ثلاثہ کے باب میں امام غزالی کی مفتیٰ بہ تکفیر کی زد پڑتی تھی) ابطال قوم و وطن میں محسوب ہوتا تھا،

ان مسائل ثلاثہ میں ہمارے نقطۂ نظر سے "عموم علم باری" یا "علم باری بجزئیات مادیہ" کا مسئلہ سب سے اہم ہے، مفکرین سابقین نے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اپنی اپنی تصانیف میں اسے اپنی فکری ورزش کا موضوع بنایا ہے، لیکن جس طرح منطقی نظم و ضبط کے ساتھ یہ بحث "سلم العلوم" کی شروح اور "میر زاہد قطبیہ" کے حواشی میں ملتی ہے، اس انداز میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (المتوفی ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۷ء) سے پہلے نہیں ملتی، انھیں کو اس انداز بحث کی ابتدا کا شرف حاصل ہے، مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر اسے اس کے تاریخی پس منظر میں بیان کر دیا جائے۔

۱۰۵۶ھ (مطابق ۱۶۴۶ء) میں شاہجہاں نے جان نثار خاں کی زیر سرکردگی ایک سفارتی مشن ایران بھیجا، اس کے عملہ میں محمد فاروق مشرف اور محب علی پرچہ نویس کو اپنی معقولات دانی پر غرہ تھا،

لہذا دونوں ایران کے وزیر اعظم سے جو "خلیفہ سلطان" کہلاتا تھا، جا بھڑے، اُس نے زیادہ بحث تو نہیں کی امتحاناً صرف اتنا ہی پوچھا کہ امام غزالی نے قدم عالم، نفی علم واجب بجزئیات مادیہ اور انکار حشر جسمانی کی بنا پر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، لیکن کچھ لوگوں نے حکماء کے کلام کو نیک محل پر محمول کیا ہے، ذرا اس کی تقریر تو کیجئے۔ ہندوستانی معقولیوں کا علم عموماً بحاشی تک محدود تھا، تحقیق واقعات سے واسطہ کم تھا، اس کا نتیجہ بقول وزیر اعظم علامی سعد اللہ خان یہ نکلا کہ

"مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند و از مسلک معقولیت دور افتادند"

شاہجہاں کو جب اس مناظرے میں ہندوستانی وفد کی شکست فاش کی خبر ملی تو ہندوستان کے علمی وقار کی ہوا خیزی پر بیحد رنج ہوا، لہذا وزیر اعظم سعد اللہ خان نے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کو خط لکھا اور اس میں ان مسائل ثلاثہ پر ایک مستقل رسالہ لکھنے کی درخواست کی تاکہ اُسے ایران بھیجا جا سکے اور اس طرح ہندوستان کا علمی وقار بحال ہو سکے۔ اس حکم کی تعمیل میں علامہ سیالکوٹی نے صرف ایک ہفتہ میں ایک رسالہ لکھ کر پیش کیا جو بعد میں "الدرة الثمین" یا "الدرة الثمینة" اور بعض لوگوں میں "الرسالة الخاقانیہ" کے نام سے مشہور ہوا،

مسائل ثلاثہ میں سے سعد اللہ خاں علامی نے دوسرے مسئلہ "علم واجب تعالیٰ بجزئیات مادیہ" کے باب میں بڑی تفصیلی ہدایات دی تھیں:-

١- احاطہ مسائل متعلقہ بایں مطلب علمی از حضوری و حصولی۔

٢- بودن علم عین عالم و عین معلوم یا غیر آن۔

٣- تعلق آن بجزئیات بر وجہ کلی است یا بوجہ جزئی است۔

٤- تحریر الکہ کلیت و جزئیت مفہوم تابع مدرِک (بکسر را) یا تابع مدرَک (بفتح را) است

٥- نسبت با حس جزئی ہست یا نہ

٦- بیان آنکہ ادراک تعقلی است نہ احساسی

٧- شمول علم بمخفیات و مشخصات از زمان و غیر آن۔

٨- بقاء علم با تغیر معلوم و تبدل زمان۔

علامہ سیالکوٹی نے بھی اسی مسئلہ (مسئلہ علم واجب) کو زیادہ اہمیت دی اور رسالہ کا بڑا حصہ اسی کی توضیح پر وقف کیا، باقی دو مسئلوں سے سرسری طور پر تعرض کیا۔ اسی لئے عام طور سے اس رسالہ کا موضوع "علم واجب" ہی سمجھا جاتا ہے، انھوں نے اس توضیح کو تین[٣] مباحث میں تقسیم کیا ہے:-

مبحث اول:- باری تعالےٰ کے لئے صفت علم کے اثبات میں،

مبحث دوم:- علم باری تعالیٰ کی حقیقت کی توضیح میں،

[اس ضمن میں انھوں نے مختلف مذاہب کو اُسی منطقی انداز میں منضبط فرمایا ہے جس طرح متاخرین بالخصوص شراح "سلم" نے کیا ہے کہ علم باری یا عین ذات باری ہو گا یا ذات باری تعالیٰ سے خارج پھر شق ثانی میں تین[٣] ذیلی شقیں نکالی ہیں۔ قائم بنفسہ، قائم بذات باری اور قائم بامر خارج]

مبحث سوم:- باری تعالیٰ کے علم کے عموم میں ہے، علامہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں اسلامی مذاہب کے پیرو عموماً عموم علم باری کے قائل ہیں، لیکن حکماء و فلاسفہ سوائے ابو البرکات بغدادی کے علم بجزئیات کے منکر ہیں۔

[اس کے بعد انھوں نے اس مسئلہ میں مختلف مذاہب کو نقل کر کے (جس کی تفصیل شارحین سلم العلوم کی اسکیم کے تحت آگے آرہی ہے) اُن کے مالہ و ماعلیہ سے بحث کی ہے]

علامہ سیالکوٹی کی یہ تقریر میر زاہد ہروی (المتوفی ١١٠١ھ مطابق ١٦٩٣ء) جو علامہ کے ہم عصر قاضی محمد اسلم کے خلف الرشید اور میر محمد فاضل بدخشی کے شاگرد تھے بڑے علم میں بھی تھی، چنانچہ انھوں نے علم کے مفاہیم ثلاثہ:- معنی مصدری (دانستن) مبدء انکشاف اور الحاضر عند الذات المدرکہ متعین کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ تینوں معانی واجب تعالیٰ میں متحقق ہیں، لیکن صرف دوسرے معنیٰ ہی میں علم اس کا

عین ہے۔ اگر صعوبت مقام اور بحث کے اشکال و اغلاق کی بنا پر تفصیل سے یہ کہہ کر معذرت کرلی۔

وتمام القول فيه يقتضى بسطاً فى الكلام لا يسعه المقام۔

اس تمام القول کو میرزاہد کی مراد علامہ سیالکوٹی کی متعلقہ تقریر ہے۔ اسی وجہ سے انکے محشیوں نے تمام القول کی وضاحت میں علامہ سیالکوٹی کی اسی توضیح کو دہرا دیا ہے جو انھوں نے الدرۃ الثمینہ میں دی ہو، اسکا اعادہ موجب تطویل ہوگا، سلسلۂ کلام کو آگے جاری رکھنے سے پہلے علامہ سیالکوٹی کے ایک افادہ کی طرف توجہ دلانا مستحسن ہوگا۔ یہ باری تعالیٰ کے علم تفصیلی کے مراتب چارگانہ کے بارے میں علامہ کی تقریر ہے۔ اسی تقریر کو قدرے حذف و ایجاز کے ساتھ اُن کے معاصر متاخر میرزاہد ہروی نے رسالہ قطبیہ میں بیان کیا ہے، ذیل میں دونوں کی تقریریں نقل کی جارہی ہیں:۔

الدرة الثمينة

ثم ان مراتب العلم التفصيلى اربع:

الاولى ما يعبر بالقلم والنور والعقل فى الشريعة وبالعقل الكل عند الصوفية وبالعقول عند الحكماء فالقلم الذى هو اول المخلوقات حاضر بذاته مع ما هو مكمون فيه عند الواجب تعالى. فهو علم تفصيلى بالنسبة الى العلم الاجمالى الذى هو عين ذاته وبسيط بالقياس الى ما فى المراتب۔

الرسالة القطبية

اعلم ان العلم التفصيلى للواجب سبحانه عين ما اوجده فى الخارج ومراتبه اربع:

احدها ما يعبر عنه بالقلم والنور والعقل فى الشريعة وبالعقل الكل عند الصوفية وبالعقول عند الحكماء فالقلم حاضر عنده تعالى مع ما يكون فيه

وثانيها ما يعبر عنه فى الشريعة باللوح المحفوظ و بالنفس الكلى عند الصوفية و بالنفوس الفلكية المجردة عند الحكماء فاللوح المحفوظ حاضر بذاته مع ما ينتقش فيه من صور الكليات عند الواجب تعالى فهو علم تفصيلى بالنسبة الى المرتبتين اللتين فوقهما۔

وثالثها كتاب المحو والاثبات وهو القوى الجسمانية التى ينتقش فيها صور الجزئيات المادية وهى المنطبعة فى الاجسام العلوية والسفلية فهذه القوى مع ما فيها من النقوش الحاضرة عنده تعالى۔

ورابعها الموجودات الخارجية من الاجرام العلوية والسفلية

واما انها حاضرة عند الواجب الوجود بذاتها فى مرتبة الايجاد

وثانيها ما يعبر عنه فى الشريعة باللوح المحفوظ وبالنفس الكلى عند الصوفية وبالنفوس الفلكية المجردة عند الحكماء فاللوح حاضر عنده تعالى مع ما فيه من صور الكليات۔

وثالثها ما يعبر عنه بكتاب المحو والاثبات فى الشريعة وهو القوى الجسمانية التى ينتقش فيها صور الجزئيات المادية وهى القوى المنطبعة فى الاجسام العلوية۔ فهذه القوى مع ما فيها من النقوش المنطبعة حاضرة عنده تعالى۔

ورابعها سائر الموجودات الخارجية والذهنية الحاضرة عنده تعالى

ذیل میں "الدرۃ الثمینہ" کے اقتباس کا ترجمہ دیا جارہا ہے، رسالہ قطبیہ کے اقتباس کا ترجمہ اسی میں مندرج ہے۔

" پھر علم تفصیلی کے چار مرتبے ہیں:۔

مرتبہ اول | وہ ہے جسے شریعت میں قلم، نور اور عقل سے، صوفیا کے نزدیک عقل کل سے اور حکماء کے نزدیک عقول سے تعبیر کیا جاتا ہے، پس قلم جو کہ تمام مخلوقات میں سب سے اول ہے، بالذات مع ان تمام اُمور کے جو اُس میں پنہاں ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہے۔ پس وہ اُس علم اجمالی کی نسبت سے جو عین ذات باری ہے، علم تفصیلی ہے مگر باقی مراتب ثلٰثہ کی نسبت سے بسیط ہے،

مرتبہ دوم | وہ ہے جسے شریعت میں لوح محفوظ سے، صوفیہ کے نزدیک نفس کلی سے اور حکماء کے نزدیک نفوس فلکیہ مجردہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس لوح محفوظ مع ان صور کلیات کے جو اس میں نقش ہیں، واجب تعالیٰ کے نزدیک بذاتہ حاضر ہے۔ پس وہ اپنے اوپر کے دو مرتبوں کی نسبت سے علم تفصیلی ہے،

مرتبہ سوم | کتاب المحو والاثبات ہے، اور اُس سے مراد وہ جسمانی قوتیں ہیں، جن میں جزئیات مادیہ کی صورتیں نقش ہوتی ہیں، اور وہ اجسام علویہ وسفلیہ میں منطبع ہیں، پس یہ قوتیں مع ان نقوش کے جو اُن میں مرتسم ہیں، باری تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہیں۔

مرتبہ چہارم | موجودات خارجیہ کا ہے، از قبیل اجرام علویہ وسفلیہ نیز اُن کے احوال۔ تو یہ اپنے مرتبہ ایجاد میں واجب الوجود کے نزدیک حاضر ہیں۔

• علامہ سیالکوٹی کا رسالہ "الدرۃ الثمینۃ" جس طرح اُس سلسلۃ الذھب کا واسطۃ العقد ہے جس کا آغاز امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں کیا تھا، اسی طرح اس علمی تحریک کا مفتتح بھی ہے، جو بعد میں مسئلہ علم واجب کے نام سے متاخر منطقیوں بالخصوص سلم العلوم کے شارحین اور رسالہ میر زاہد کے محشیوں کی فکری سرگرمیوں کا موضوع رہا ہے، انھوں نے ہی علم واجب کے اندر احتمالات پنجگانہ اور مذاہب عشرہ کی اسکیم کی ابتدا کی، چنانچہ فرماتے ہیں:-

• جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم یا تو اس کی ذات کا عین ہوگا یا اُس سے خارج ہوگا۔ (بصورت ثانیہ) یا تو بنفسہ قائم ہوگا یا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوگا، یا کسی خارجی

امر کے ساتھ قائم ہوگا، ان احتمالات اربعہ کے علاوہ اور کوئی احتمال نہیں ہے:

اس کے بعد انھوں نے علم باری تعالیٰ کے باب میں مختلف مذاہب کی بڑی شرح وبسط سے تفصیل دی ہے۔

جیسا کہ سابق میں کہا گیا کہ علامہ سیالکوٹی کی یہ تقریر میر زاہد کے علم میں تھی، مگر صعوبت مقام اور بحث کے اشکال و اغلاق کی بنا پر یہ کہہ کر کہ "تمام القول فیہ یقتضی بسطا فی الکلام لا یسعہ المقام" تفصیل سے معذرت کر لی۔ مگر ان کے محشیوں نے "تمام القول" کی وضاحت میں علامہ ہی کی توضیح کو جو انھوں نے "الدرۃ الثمینۃ" میں دی ہے، دہرا دیا ہے چنانچہ مولوی غلام یحییٰ نے "لواء الہدیٰ فی اللیل والدجیٰ" میں لکھا ہے،

"و تمام القول فیہ الخ۔ یعنی باری تعالیٰ کا علم بالفعل واضح تفصیل کا مقتضی ہے، اس سلسلے میں اجمالی قول یہ ہے کہ باری تعالیٰ بذاتہ عالم ہے یا بالغیر یا عالم نہیں ہے شق اول کے مطابق علم یا تو اس کا (باری تعالیٰ کا) عین ہوگا یا غیر، شق ثانی کے مطابق یا تو وہ ایسی صفت ہوگا جو ذات باری کے ساتھ قائم ہے مگر اپنی ذات میں متعدد ہے، اور وہ تمام ممکنات کی صورتوں کا دوسرا نام ہے، یا فی ذاتہ واحد اور بسیط ہے، جس کا کائنات کے تمام افراد سے تعلق ہے، یا پھر وہ ایسی صفت ہوگی جو ذات باری کے ساتھ قائم نہیں ہے (اس صورت میں چھ ذیلی شقیں نکلتی ہیں) ممکنات اپنے وجود دہری کے ساتھ باری تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہونگے، یا وہ جوہری اور عرضی صورتوں کے ساتھ حاضر ہونگے جو اپنی (ان صورتوں) کی ذوات سے قبل بذات خود قائم ہیں۔ یا خود اُن اشیاء کے حضور کے ساتھ . . . . . . بطور حضور اشراقی کے حاضر ہونگے یا ممکنات معدومہ کے نفس ثبوت کے ساتھ بطور ثبوت خارجی کے حاضر ہونگے یا ممکنات کے ثبوت علمی کے بطور بلا تحقق واقعی کے مانند مرایا کے حاضر ہونگے۔

یا معقول اور عاقل کے اتحاد کے طور پر حاضر ہونگے۔ پس یہ دس مذہب ہیں اور ہر ایک کی جانب ایک جانے والا گیا ہے، رہی حق کی تحقیق تو وہ کتب مبسوطات میں مذکور ہے،،

اسی طرح مولانا فضل اللہ لکھنوی نے اپنے حاشیہ میں اس اسکیم کو دوسرے لفظوں میں دہرایا ہو، لیکن جس شرح وبسط سے مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی نے اسے لکھا ہے، وہ اپنی آپ مثال ہے،

"الدرۃ الثمینۃ" کے انداز فکر کی اتباع کرنے والوں کی دوسری جماعت "سلم العلوم" کے شارحین کی ہے، جس میں سر فہرست قاضی مبارک گوپامئوی کا نام ہے، مزید تفصیل حسب ذیل ہے،

میرزاہد کے ایک شاگرد ملا صالح بنگالی تھے، جن کے دو خاص شاگرد تھے، ملا اشرف اور قاضی مبارک گوپامئوی، اس لئے ملا صالح کے توسط سے قاضی مبارک گوپامئوی کو (جو بقول مولانا فضل امام خیرآبادی "سلم العلوم" کے سب سے پہلے شارح ہیں، وہ پوری تفصیل پہنچی تھی جسے میرزاہد "قطبیہ" میں عدم گنجائش کی بنا پر (لا یسعہ المقام) تحریر نہیں کر پائے تھے، مگر جو حسب توضیح مولوی غلام یحییٰ (لواء الہدیٰ فی اللیل والدجی) یہ وہی تھی جو علامہ سیالکوٹی نے "الدرۃ الثمینۃ" میں سپرد قلم فرمائی تھی۔

اس سلسلۂ تلمذ کے علاوہ قاضی مبارک کا سلسلہ براہ راست بھی علامہ سیالکوٹی تک پہونچتا ہے، کیونکہ موخر الذکر کے ایک شاگرد مولانا عبد الرحیم مراد آبادی تھے، ان کے شاگرد مولانا شہاب الدین گوپامئوی اور اُن کے شاگرد اُن کے صاحبزادے ملا قطب الدین گوپامئوی تھے، ملا قطب الدین کے شاگرد قاضی مبارک تھے، جنھوں نے اپنی "شرح سلم" میں مسئلہ علم واجب کی ابتدا بدیں طور کی ہے۔

"اعلم ان مسألۃ علم الواجب مما تحیرت فیہ الافہام":

[جاننا چاہئے کہ مسئلہ "علم واجب" اُن مسائل میں سے ہے جن میں عقل وفہم حیران وسرگشتہ رہی ہیں]

اس کے بعد انھوں نے اس مسئلہ میں مختلف مذاہب کو گنایا ہے جس کی تفصیل ملاحسن کے ضمن میں آرہی ہے،

بعد میں سلم العلوم کے دوسرے شارحین نے بھی اسی روش کی پیروی کی، چنانچہ مولانا بحر العلوم نے اپنی "شرح سلم العلوم" میں فرمایا:۔

"اختلفوا فی کیفیتہ اختلافا عظیما":

[علم واجب کے مسئلہ میں محققین کا شدید اختلاف ہے]

زاں بعد انھوں نے اس "اختلاف عظیم" کی تفصیل میں نو مذاہب گنائے ہیں جو شیخ مقتول، نصیر الدین طوسی، افلاطون، معتزلہ، فرفوریوس، ماتریدیہ، میر باقر داماد، ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کی طرف منسوب ہیں۔ آخر میں اپنے قول مختار کو بیان کیا ہے۔

لیکن اس مسئلہ کی سب سے سلجھی ہوئی تفصیل ملاحسن نے اپنی "شرح سلم العلوم" میں دی ہے، پہلے تو انھوں نے مسئلہ علم واجب کی اہمیت بتائی ہے۔

"مقصود کے چہرے سے اس وقت تک پردہ نہیں ہٹے گا، جب تک مسئلہ علم واجب کو بیان نہ کیا جائے جو اہم ترین مسائل میں سے ہے، اور جس میں عقل وفہم حیران وسرگشتہ رہی ہیں، کیونکہ ابھی تک کسی نے اس کی ایسی توضیح نہیں بیان کی جو اہل خرد کے دل کو لگتی ہو،

اس کے بعد انھوں نے احتمالات پنجگانہ اور مذاہب عشرہ کو گنایا ہے، پہلے انھوں نے احتمالات عقلیہ کو ضبط کیا ہے،

"ممکنات کے ساتھ باری تعالیٰ کا علم یا تو

(۱) اس کی ذات کا عین ہوگا۔

(۲) یا ذات باری کا جزء ہوگا (مگر اس کا کوئی قائل نہیں ہے)

(۳) یا ذات باری کے ساتھ قائم ہوگا":

پھر اس آخری احتمال میں انھوں نے تین ذیلی احتمال قائم کئے ہیں،

باری تعالیٰ کا علم یا تو

۱۔ اُس کی ذات کے ساتھ منضم ہوگا۔

۲۔ یا اُس سے منتزع کیا گیا ہوگا،

۳۔ یا اُس سے علیحدہ کوئی امر ہوگا،

[واضح رہے کہ مذکورۂ بالا احتمالات میں سے اس احتمال کا کہ "علم باری ذات باری تعالیٰ کا جزو ہو" کوئی قائل نہیں ہے۔ اس لئے علامہ سیالکوٹی کی حقیقت پسندی نے اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا، اور صرف چار احتمالات ہی گنائے تھے۔

"اعلم ان علمہ تعالیٰ اما ان یکون عین ذاتہ او خارجاً عنہ اما قائماً بنفسہ او بذاتہ او بامر خارج۔ لا مزید علی ھذہ الاحتمالات"۔

مگر متاخرین نے منطقی ضبط کے لئے اسے بھی محسوب کر کے علامہ سیالکوٹی کے احتمالاتِ چہارگانہ کو احتمالات پنجگانہ میں تبدیل کر دیا۔]

پہلے احتمال میں تین مذاہب ہیں۔

(۱) صوفیائے کرام کا کہنا ہے کہ عالم میں سوائے ذات باری کے اور کچھ ہے ہی نہیں پس علم باری تعالیٰ اُس کی ذات ہی کا خاصہ ہے۔

(۲) فرفوریوس کا کہنا تھا کہ عاقل و معقول متحد بالذات ہیں۔ [یہ بھی صوفیائے کرام کے قول ہی کا ایک دوسرا انداز ہے۔

(۳) حکمائے متاخرین کا کہنا ہے کہ ہر چند ذات باری تعالیٰ ممکنات سے مختلف ہے، بایں ہمہ وہ ان کے تفصیلی انکشاف کی کاشف ہے۔

دوسرا احتمال (شق انضمامی) ارسطو اور فارابی و ابن سینا کا مختار ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اشیاء کی صورتیں ذات باری میں مرتسم ہیں۔

تیسرا احتمال کہ علم باری تعالیٰ امر انتزاعی ہے، متکلمین کا مذہب ہے، وہ کہتے تھے۔

"علم باری ایک بسیط صفت ہے جو اضافی تعلقات پر مشتمل ہے، پس ممکنات میں سے ہر ایک کے انکشاف کا مناط وہ اضافت خاصہ ہے"۔

چوتھے احتمال میں کہ علم باری تعالیٰ امر منفصل ہے، پانچ مذہب ہیں۔

(۱) افلاطون کا کہنا ہے کہ علم باری بالممکنات "صور قائمہ" (مجردہ عن المادہ جنھیں امثال افلاطونی بھی کہتے ہیں) سے مراد ہے۔

(۲) اکثر مشائین (پیروان ارسطو) کا قول ہے علم باری تعالیٰ سے مراد ممکنات کا وجود دہری ہے۔ پس ممکنات (وجود دہر میں موجود اور باری تعالیٰ کی ذات میں حاضر ہیں) ہی علم باری کا مصداق ہیں۔

(۳) بعض دیگر مشائیہ (بالخصوص محقق طوسی) کا مسلک یہ ہے کہ تمام اشیاء کی صورتیں "عقل اول" میں موجود ہیں اور "عقل اول" ان تمام صورتوں کے ساتھ باری تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہے، اس طرح "عقل اول مع صور" ہی علم باری کا مصداق ہے۔

(۴) معتزلہ کا کہنا ہے کہ علم باری تعالیٰ سے مراد وہ معدومات ممکنہ ہیں جو اس کے علم واقع میں ثابت تو ہیں مگر غیر موجود ہیں۔

(۵) شیخ الاشراق (شیخ مقتول) کا مذہب یہ ہے کہ باری تعالیٰ اشیاء کو "اشراق نوری" کے ذریعہ جانتا ہے۔

بعد کے محشیوں میں مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی نے "التحقیقات المرضیہ" میں ان مذاہبِ عشرہ کو مع مالہ و ما علیہ بڑی شرح و بسط سے ذکر کیا ہے۔

اس طرح یہ مسئلہ ہندوستان کی اسلامی فکر میں ایک اہم مسئلہ بن گیا۔

مگر مصنف (فرانز روزنتھال) نے اس سے قطعاً تعرض نہیں کیا، اس فروگزاشت کے لیے ہمیں ان سے اس لئے تو شکوہ نہیں ہے کہ اس سے ہندستانی عبقریت کے ساتھ اُن کے ازدرا رو استخفاف کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ اس لیے شکوہ ہے کہ ایسا کرنے سے کتاب کا ایک اہم حصہ تشنۂ تکمیل رہگیا۔

بہرحال نام نہاد خدائی علم کی بحث خواہ یورپ اور امریکہ میں مرتب کی جائے یا برصغیر پاک و ہند میں اُس وقت تک تشنۂ تکمیل رہے گی جب تک سلم العلوم کے شارحین اور میرزاہد قطبیہ کے محشیوں کے افادات سے اس باب میں کمس فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

مفی ما مضی۔ مصنف (روزنتھال) تک تو یہ بات کہاں پہونچ پائیگی، البتہ اگر ہمارے یہاں کوئی حوصلہ مند

ہم لگے جانے والوں کی تقلید کیوں کریں   اے خوردہ گیر نحن رجال وہم رجال

پہ عمل کرتے ہوئے اس کڑی کمان کو نہ کرنے کی جرأتِ رندانہ کرے تو کم از کم اسے روزنتھال کی غلطی کا اعادہ نہ کرنا چاہیے۔

انقضائے معروض | فاضل تبصرہ نگار کے تبصرہ کا ماحصل اُن کا یہ ارشاد گرامی ہے۔

"بلا (خوف) تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اور علم کے موضوع پر آج تک کسی زبان میں ایسی جامع اور فکر انگیز کتاب شائع نہیں ہوئی"

فاضل تبصرہ نگار کا مطالعہ بہت زیادہ وسیع ہے، اس لیے انھیں یہ دعوی کرنے کا حق پہونچتا ہے، اس کے بعد ایک قلیل المطالعہ نوآموز طالب علم کو جس کی نظر چند درسی کتابوں تک محدود ہو۔

اُن کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں -

سے زیادہ اور کچھ عرض کرنے کی جسارت نہیں کرنا چاہئے۔

ممکن ہے اس اجمالی تبصرہ میں اُن کاروانِ سخن اپنے سست رفتار کوتاہ ہمت ہم قوم افراد کی طرف بھی ہو لیکن اگر ہمارا اہل الرائے طبقہ ناراض نہ ہو تو پھر یہ عرض کرنے کی اجازت مل جائے کہ اس میں ان کوتاہ ہمتوں کی کوتاہی پرواز کے ساتھ شاید شائبہ خوبی تقدیر کو بھی دخل ہے اور یہ شائبہ خوبی تقدیر مختلف عوامل کے مجموعی نتیجہ کا نام ہے مگر اس کا تجزیہ شکوہ سنجی کے مترادف ہوگا، ورنہ

فیضِ روح القدس ار باز مددی فرماید   دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحائی کرد

آخر میں یہ عرض کرنا مستحسن ہوگا کہ کسی کتاب کے باب میں دوٹوک رائے کے اظہار سے پہلے اس کا پوری دقت نظر کے ساتھ مطالعہ اور مآخذ و مراجع سے محتویات کتاب کا مطالعہ ضروری ہے، کتاب یا مصنف کی کاوش کی کوتاہیوں یا فروگزاشتوں کی نشاندہی کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، یہ تو خود اپنی ہی تنگیِ چشم حسود کا اظہار ہے، البتہ اگر نقاد کی نظر میں ہو تو اس امر کی وضاحت ضرور قابل ستائش ہوگی کہ مصنف نے پیش نظر شاہکار مرتب کرکے علم و ادب کی خدمت میں کیا حصہ لیا ہے، اور آیندہ مزید ترقی کا امکان ہے یا نہیں۔

زاں بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ مصنف نے جن مآخذ و مصادر سے استفادہ کیا ہے، کیا اُن کے علاوہ اور بھی مآخذ و مراجع تھے، اگر اس بات کا جواب اثبات میں ہو، تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ فروگذاشت کیوں ہوئی۔

آیا مصنف نے انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھا (تو اُس کی وجہ بتانا چاہئے)

یا اس کے علم میں نہیں تھے،

یا پھر اُس کی دسترس سے باہر تھے،

ان دو باتوں کی نشاندہی سے اس موضوع پر آیندہ تحقیقات کرنے والوں کی ہمت افزائی ہوگی، اور یہ امر علم و حکمت کی ترقی کے باب میں موثر اور قوی ثابت ہوگا۔

بہرحال کتاب فرزندانِ مشرق کے لئے ایک چیلنج ہے، کاش کوئی جواں ہمت حسود و غیور اس للکار کو قبول کرلے۔

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف   اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

قرآن عربی زبان وادب کی کسوٹی

از

پروفیسر عبد الحلیم ندوی صدر شعبۂ عربی، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد

قرآن شریف اللہ کی وہ مقدس کتاب ہے، جسے اس نے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ عربی زبان کے قریشی لہجہ میں نازل فرمائی، یہ کتاب عرب کے دو مشہور شہروں میں آپ پر نازل ہوئی، ان میں سے ایک مکہ معظمہ ہے جہاں آپ کی ولادت مسعود ہوئی تھی، اور نبوت ملنے کے بعد تیرہ[۱۳] برس اسلام کی دعوت دیتے رہے، اور دوسرا مدینہ منورہ ہے، جہاں آپ مکہ چھوڑ کر جا بسے تھے، اور عمر کے باقی دس سال آپ نے وہاں گذارے، اور وہیں آپ کی وفات بھی ہوگئی، قرآن شریف کی بعض آیتیں آپ کے بعض سفروں کے درمیان بھی نازل ہوئیں۔

قرآن کریم آپ پر تیئیس[۲۳] سال کی مدت میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا، اس کی مصلحت یہ تھی کہ مسلمان رفتہ رفتہ نئے دین اور اس کی بنیاد پر قائم نئی زندگی، اور اس سے متعلق اصول، قواعد وضوابط اور اس کے تقاضوں کے عادی ہوتے جائیں، تاکہ بیک وقت پرانی روش سے ہٹنے میں جو شدید تکلیف ہوتی ہے اس کا احساس کم سے کم تر رہے، اور آہستہ آہستہ اسلام اور اس کی تعلیمات ان کے دلوں میں گھر کرتی جائیں، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ (وقرآناً فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث

ونزلناہ تنزیلا)، قرآن کے اترنے کی ابتدا رمضان کی شب قدر سے ہوئی، (اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِی لَیْلَۃِ الْقَدْرِ) اور صاف ستھری اور واضح عربی زبان میں روح امین (جبرئیل فرشتہ) کے ذریعہ آپ کے قلب پر اس کا نزول ہوا، تاکہ آپ لوگوں کو ان کے انجام اور عاقبت سے ڈرا سکیں، (وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین) اسے فرشتہ جبرئیل آپ کے پاس خدا کی طرف سے لے کر آتے تھے (نزلہ روح القدس من ربک بالحق)۔

مکہ کی سب سے پہلی سورت قرآن کے اترنے کی ابتدا ۶۱۱؁ سنہ عیسوی سے ہوئی، اور سب سے پہلی سورت جو آپ پر مکہ میں نازل ہوئی وہ سورت "العلق" کا یہ حصہ تھا، (اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خلق الانسان من علق، اِقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم) یہ آیتیں آپ پر ان دنوں اتریں جب آپ مکہ کے قریب غار حرا میں تنہا بیٹھ کر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے، اور اس کی ذات وصفات اور نظام کائنات وغیرہ پر غور فرمایا کرتے تھے۔

مدینہ کی سب سے پہلی سورت ۶۲۲؁ء میں آپ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ میں آپ پر سب سے پہلے سورہ "المطففین" کی یہ آیتیں نازل ہوئیں، (ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون، الا یظن اولئک انھم مبعوثون لیوم عظیم، یوم یقوم الناس لرب العالمین) کیونکہ یہاں کے لوگ ناپ تول میں کمی بیشی کرتے تھے۔

آخری آیت قرآن کریم کی آخری آیت جو آپ پر اتری وہ یہ ہے

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (مائدہ)	یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو تمہارے لئے بطور مذہب کے پسند کیا۔

اور اس اعلان کے بعد ساری نسل انسانی کے لئے اس نے اسلام کو مذہب قرار دیا، کیونکہ یہ تمام مذاہب کا نچوڑ اور انکی آخری شکل ہے، یہ آیتیں آپ کے آخری حج کے موقع پر اتری تھیں جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔

چونکہ اب آنحضرت صلعم کا مشن مکمل ہوچکا تھا، اسلام اور اس کی تعلیمات جزیرہ نمائے عرب کے ہر خطہ میں پھیل چکی تھیں، اور سچے مخلص اور اللہ پر کامل یقین اور بھروسہ رکھنے والے مسلمانوں کی ایک جماعت پیدا ہوچکی تھی، جو آپ کی خاص تربیت کردہ تھی، اس لئے اب خدا کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہ گئی تھی، چنانچہ اس آخری حج کے چند مہینوں کے بعد آپ کا وصال ہوگیا۔

قرآن کی سورتوں اور آیات کی تعداد قرآن شریف میں ایک سو چودہ[۱] چھوٹی بڑی سورتیں ہیں، ان میں سے اکیانوے[۲] مکہ میں اور تئیس[۳] مدینہ میں نازل ہوئیں، ہر سورت میں مختلف چھوٹی بڑی آیتیں ہیں جنکی تعداد بسم اللہ کو چھوڑ کر چھ ہزار دو سو چودہ ہے، تلاوت کرنے میں آسانی کے خیال سے پورے قرآن کو تیس پاروں یا حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے، پھر ہر پارہ یا حصہ کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے، پھر ان دونوں کو بھی مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ان حصوں کو رکوع کہتے ہیں اس طرح ایک پارہ مختلف چھوٹے حصوں یعنی رکوع میں بٹا ہوا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی رہے۔[۱]

قرآن کریم کے موضوعات اور اس کی تعلیمات مکی سورتوں میں مکی سورتیں مدنی سورتوں کے مقابلہ میں چھوٹی ہیں، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینے کی ابتدا مکہ سے کی تھی، اسلئے ان سورتوں میں سب سے پہلے خدا کا واضح اور صاف تصور دیا گیا ہے، اور اس کے بعد صرف اسکی عبادت اور پرستش کرنے کا حکم ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا بلا شرکت غیرے ایک ہے، بے نیاز ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ قادر مطلق ہے یعنی وہ جو چاہے کرے اس پر روک ٹوک یا منع کرنے والا کوئی نہیں، زمین و آسمان، چرند و پرند، انسان اور سارے جاندار اس کے پیدا

۱۔ ڈاکٹر شوقی ضیف: تاریخ الادب العربی ۲-۲۰ مطبوعہ دارالمعارف مصر طبعہ ثمانیہ

کئے ہوئے ہیں، پوری کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے، اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا، ہر آدمی کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اس کے سامنے پیش ہونا ہے، اور دنیا میں جو کچھ کیا ہے، اس کا حساب کتاب دینا ہے اور اس کے مطابق اچھے کام پر انعام پانا ہے، جسے جنت کہتے ہیں، اور برے کام پر سزا بھگتنی ہے، جسے دوزخ کہتے ہیں، وہ معاف کرنے والا ہے، لیکن بہت سخت سزا دینے والا بھی ہے، وہ بہت مہربان اور بڑا رحم والا ہے، مگر جبار و قہار بھی ہے، وہ عالم الغیوب ہے، اور ہمارے دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے، اس کے سامنے ہر چیز کا ظاہر و باطن کھلا ہوا ہے،

خدا کے واضح تصور اور اس کی وحدانیت کی تعلیم کے بعد قرآن میں اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی گئی ہے جیسے عدل، احسان، وعدہ کا پورا کرنا، غلطی کرنے والے کو معاف کر دینا، اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کی ہے، جیسے زنا، قتل کرنا، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، ناپ تول میں کمی کرنا اور ان تمام باتوں سے روکا ہے، جن سے خدا کا انکار لازم آتا ہے،

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو نماز اور زکوٰۃ جیسے ارکان دین کا صرف اصولی حیثیت سے مکی سورتوں میں ذکر ہے، ان کی تفصیل یا موجودہ شکل مدینہ میں دی گئی، مثلاً زکوٰۃ کا مفہوم مکہ میں صرف یہ تھا کہ خدا کے راستے اور بھلائی کے کام میں خرچ کیا جائے، لیکن اس کے لیے زر نقد کی تعیین تعداد اموال کی خاص مقدار مقرر نہیں تھی، اور نہ اس کا کوئی خاص نظام تھا، یہ سب مدینہ میں ہوا، اسی طرح نماز کا عام حکم تھا، لیکن پانچ وقت کی تعداد مکہ میں مقرر نہیں ہوئی تھی،[۱] اس قسم کے احکام کی غالباً بہترین مثال سورت الانعام ہے، جو مکہ میں نازل ہوئی تھی،

مکی سورتوں میں گزشتہ نبیوں اور پرانی قوموں کے قصے بھی بیان کئے گئے ہیں، جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جن قوموں نے خدا کے احکام کی تعمیل کی خدا نے ان کو ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا اور جب

۱۔ ڈاکٹر احمد امین۔ فجر الاسلام۔ ص ۲۲۰ تا ۲۲۸

انھوں نے نافرمانی کی تو انکو تہس نہس کر دیا، ان کو بندر، خنزیر، اور دوسرے جانوروں کی شکلوں میں مسخ کیا ان کی بستیاں الٹ دیں، آندھی، طوفان اور زلزلوں کی سخت لرزہ بر اندام کرنیوالی صورتوں کے بعد آسمان کو خون کی بارش بطور سزا برسائی ان میں سے بعض کو صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیا کہ آج انکا نام لینے والا بھی کوئی نہیں[1]۔ دوسری طرف مکی سورتیں مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کر کے عقل انسانی کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں، کہ یہ سارا نظام کائنات یونہیں بغیر کسی چلانے والے کے نہیں چل رہا ہے، بلکہ اسکے پیچھے ایک قوت محرکہ ہے، جس کے چشم و ابرو کے اشارہ کا یہ سب کرشمہ ہے، قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ دور کیوں جاؤ تم خود اپنے وجود اور اس وجود کی ابتدا اور شکم مادر میں صرف ایک قطرے سے اپنے تمام اعضاء و جوارح کے بننے اور ان کی پیچیدہ اور نازک ترکیب، بناوٹ اور پھر ان کے مختلف فرائض اور کام اور زندگی کے متعلق ان کی ناگزیری پر غور کرو تو سمجھ میں آجائے گا کہ یہ سب کاریگری کسی ایک خاص ہستی کی ہے، جو در حقیقت خالق اور مدبر ہے، جس نے ہر چیز بڑی باریک بینی اور جزرسی سے بنائی ہے، اور وہ ہے اللہ رب العلمین سارے جہان کا پالن ہار مالک و مختار اور جزا و سزا کے دن کا تنہا حاکم اور جج۔

مدنی سورتیں

مدنی سورتوں میں جو نسبتاً لمبی ہیں، اسلام کے ارکان دینی کا بیان ہے، مثلاً نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ کے متعلق تفصیلی احکام ہیں، اور چونکہ یہاں سے ایک نئے معاشرے کی ابتدا ہو رہی تھی، اور ایک نئی اسلامی مملکت کی داغ بیل پڑ رہی تھی، اس لئے سماج سے متعلق احکام، فرد کے اور سماج کے تعلقات اور حقوق و فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے، پاس پڑوس، خاندان، عزیز و اقارب، ماں باپ، اور دوسرے متعلقین کے حقوق و فرائض گنائے گئے ہیں، اور خاص طور سے شادی بیاہ

---

[1] اس قسم کے قصوں سے عربی اور اردو کی کتابیں بھری پڑی ہیں، قرآنی قصوں پر مشتمل جدید ترین کتاب "القصۃ القرآنیہ والصورۃ الفنیۃ" مرتبہ فتحی رضوان ہے، اس کتاب میں مرکزی قصہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن میں ۲۰ مرتبہ آیا ہے، کتاب قاہرہ میں چھپی ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے رسالہ "المصور" قاہرہ مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۵۹ء ص ۸۸ - ۸۹۔

اور طلاق کے معاملات اور ان کے احکام، وراثت کے قوانین اور حرام و حلال کی تفصیل گنائی گئی ہے، ملکی سیاسی اور معاشی معاملات سے متعلق اصول، قواعد، ضوابط اور بنیادی باتوں کا ذکر ہے اور اسی کے ساتھ نظام جماعت، نظام حکومت اور طریقۂ حکومت، نظام عدالت، نظام معیشت، اور لین دین تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر اور طور طریقوں کی تفصیل ہے، ان کے علاوہ اسلام میں دشمن عناصر سے معاملہ کرنے ان سے جنگ و صلح کرنے کے اصول اور ضابطے متعین کئے گئے ہیں، دوسری قوموں سے تعلقات قائم کرنے انھیں استوار رکھنے، ان سے جنگ و صلح اور امن کے سلسلے میں معاہدے کرنے، ذمیوں کے ساتھ سلوک اور ان کے حقوق و فرائض کے رہنما اصول بنائے گئے ہیں، اس قسم کی بہترین مثال دو مدنی سورتیں یعنی سورہ بقرہ اور النساء ہیں، غرض کہ مدنی سورتوں میں اسلام کی دینی اور دنیاوی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے، اور مسلمانوں کو اسی خاکہ اور اس کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے، چنانچہ خود رسول اللہ صلعم نے ان کے مطابق زندگی گزار کر ان کا عملی ثبوت دیدیا۔

قرآن کریم کی جمع و تدوین

قرآن کریم چونکہ کلام الٰہی ہے اور نسل انسانی کے لیے دائمی ضابطۂ حیات کے طور پر نازل ہوا ہے اسلئے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے ارشاد خداوندی ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (حجر)

ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کو قرآن کی حفاظت کی اتنی فکر رہتی تھی کہ آپؐ اکثر اوقات اس کی تلاوت کرتے اور اسے دہرانے میں لگے رہتے، کبھی ایک ساتھ کوئی لمبی سورت نازل ہو جاتی تو آپ بھول جانے کے ڈر سے جلدی جلدی اسے دہراتے اور گھنٹوں اس میں لگا دیتے، چنانچہ اللہ نے آنحضرتؐ کی یہ فکر یہ کہہ کر دور کر دی کہ

ان علینا جمعہ وقرآنہ اس کے جمع کرنے اور تلاوت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن اترتا تھا تو آپ کاتبین وحی سے جن کی تعداد ساٹھ سے نوے تک بتائی جاتی ہے، یہ ترتیب لکھوا دیتے تھے، اس زمانے میں عرب میں کاغذ کا وجود نہ تھا، اس لئے چمڑے کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، ہڈی اور چکنے پتھروں پر آیتیں لکھ لی جاتی تھیں، اسی کے ساتھ تمام صحابہ انھیں زبانی یاد کر لیتے تھے، اس طرح لکھنے کے علاوہ بیک وقت سینکڑوں سینوں میں بھی قرآن محفوظ ہوتا رہتا تھا، چنانچہ آپ کی زندگی ہی میں پورا قرآن، آپ کے حکم سے اور آپ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق بجنسہ مرتب ہو چکا تھا، اور جب آپ کا انتقال ہوا ہے تو یہ مرتب قرآن آپکے بعد آپ کے خلیفہ حضرت ابو بکرؓ کو ملا،

جنگ یمامہ میں جب سات سو سے زائد حفاظ قرآن شہید ہو گئے، تو حضرت عمرؓ کو فکر ہوئی، کہ اگر اسی طرح قرآن کے حافظ جنگوں میں شہید ہوتے رہیں گے تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ گنے چنے چند ہی حفاظ رہ جائیں، اور پھر ایک دن سینوں سے قرآن بالکل ہی مٹ جائے۔ چنانچہ آپ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور اس خطرہ کا اظہار کرنے کے بعد کہا کہ آپ قرآن شریف کو یکجا جمع کیوں نہیں کرا دیتے؟ حضرت ابو بکرؓ کو شروع میں تردد ہوا لیکن آخر میں بات آپ کی سمجھ میں آگئی، اور آپنے حضرت زیدؓ بن ثابت کو جو خاص کاتبین وحی میں سے تھے، حکم دیا کہ اسے ایک جگہ جمع کر دیں چنانچہ انھوں نے چمڑوں کے ان ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، چکنے پتھروں اور ہڈیوں سے قرآن شریف کو ایک جگہ جمع کیا، اسکے بعد بڑے بڑے صحابہ کے سامنے جنھیں پورا قرآن زبانی یاد تھا جیسے حضرت ابی بن کعبؓ، عثمان بن عفانؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، طلحہؓ، حذیفہ الیمانؓ، ابو ہریرہؓ، ابو درداؓ، ابو موسیٰ الاشعریؓ کے سامنے پیش کر کے اس کی تصدیق کرائی، اس طرح جب یہ نسخہ مکمل ہو گیا تو

حضرت ابو بکرؓ کے پاس رکھ دیا گیا کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو یہ قرآن آپ کے پاس رہا، آپ کی وفات کے بعد یہ قرآن آپ کی صاحبزادی اور ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کے بعد جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور فتوحات کا سلسلہ خاصا بڑھنے لگا، اور دوسری قوموں کے لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے اور انھوں نے قرآن کو اپنے لہجوں میں اور غلط اعراب کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تو قرآن میں اختلاف پیدا ہونے کا ڈر پیدا ہوا، چنانچہ حذیفہ الیمانؓ صحابی نے جو خود بھی وحی لکھنے والوں میں تھے، آرمینیہ اور آذربیجان کی فتح کے موقع پر مسلمانوں کو مختلف لہجوں اور مختلف اعراب سے قرآن پڑھتے سنا تو انھیں قرآن میں اختلاف پیدا ہونے کا خطرہ محسوس ہوا، چنانچہ وہ فوراً حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور کہا کہ امیر المومنین مسلمانوں میں قرآن کے معاملے میں اتنا اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ان کی حالت بھی یہود و نصاریٰ کی طرح نہ ہو جائے حضرت عثمانؓ کو معاملہ کی نزاکت کا احساس ہوا، چنانچہ حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپکے پاس جو قرآن ہے اسے ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اس سے کئی نسخے کرانے کے بعد آپ کے پاس دوبارہ واپس بھیج دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ قرآن آپکے پاس بھیج دیا، اور آپ نے زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن الزبیرؓ، سعد بن العاصؓ، عبد الرحمانؓ بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا کہ اس کی نقلیں کریں، چنانچہ ان لوگوں نے اس نسخہ سے ۳۰ نسخہ میں پورا قرآن نقل کیا، اور اس کا نام "امام" رکھا گیا،[1] اس کے بعد حضرت حفصہؓ کو ان کا قرآن واپس کر دیا گیا، حضرت عثمانؓ نے اپنے اس نسخہ سے جس کا نام "امام" تھا، مزید نسخے لکھوائے، اور انھیں مکہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھجوایا۔[2] اور حکم دیا کہ اب صرف

---

[1] الفہرست لابن ندیم ص ۲۱ [2] نفح الطیب ۲۸۸/۱

انھیں نسخوں کے مطابق قرآن کی تلاوت کی جائے، باقی تمام نسخوں کو آپ نے جلوا دیا،[1] اور اس طرح ایک متفقہ قرآن سارے ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا، اور حفاظ صحابہ نے اسی کے مطابق مفتوحہ علاقوں میں قرآن کی تعلیم دینا شروع کر دی، چنانچہ لہجوں اور اعراب کی غلطیوں کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، حضرت عثمانؓ کے ارسال کردہ نسخوں سے مسلمانوں نے اپنے ذاتی نسخے بھی بڑی تعداد میں لکھے، چنانچہ مسعودی نے مروج الذہب میں حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ کا پلہ بھاری ہوا، اور عمرو بن العاصؓ نے قرآن کو حکم بنانے کا نعرہ لگایا تو معاویہؓ کے لشکر نے تقریباً پانچ سو قرآن نیزوں پر بلند کر کے قرآن کی ثالثی کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا، اور یہ سب جانتے ہیں کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے ارسال کردہ قرآن پر صرف سات سال کی مدت گزری تھی، کیونکہ جنگ صفین سنہ ۳۷ھ میں ہوئی ہے۔[2]

صحابہ حفاظ مختلف قبائل کے تھے، چنانچہ ان میں سے بعض حفاظ بعض حروف یا الفاظ کو اپنے قبیلہ کے رائج طریقہ سے ادا کرتے تھے، اس سے قرأت کے کئی طریقے نکلے بعد میں ایک مستقل فن وجود میں آگیا، جسے "فن تجوید" یا "قراۃ" کہتے ہیں، اس فن کے سات امام یہ تھے، ابن عامر، ابن کثیر، عاصم، ابو عمرو بن العلاء، حمزہ، نافع اور الکسائی،

اس طرح یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ قرآن کریم جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، بالکل اسی طرح آج تک محفوظ ہے، کیوں کہ جیسے ہی کوئی آیت اترتی، آنحضرتؐ فوراً ترتیب کے مطابق اسے لکھوا دیتے، پھر تمام صحابہ اسے زبانی یاد کر کے پانچوں وقت نمازوں میں پڑھنا شروع کر دیتے، اس کے علاوہ خدا کی طرف سے قرآن کی حفاظت کے لیے یہ احتیاط برتی گئی کہ ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام خود آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکمل قرآن کی ترتیب کے ساتھ

[1] مختصر ابی الفداء ۱/۱۰۶ [2] مروج الذہب ۲/۲۰

تلاوت کرتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن کو ترتیب سے پڑھتے تھے، تاکہ آپ بھی اسی ترتیب سے اس کی تلاوت فرمائیں، جس سال آپ کا وصال ہوا ہے، حضرت جبرئیلؑ نے دو مرتبہ آپ کے سامنے قرآن دہرایا،

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو نازل ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گزر رہا ہے اسکے باوجود اس کے ایک لفظ میں بھی رد و بدل نہیں ہوا ہے، اور آج تک وہی قرآن دنیا میں رائج ہے، چونکہ یہ صحیفہ خداوندی اسلام کا دستور اور مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے اسلئے اسکو زبانی یاد کرنے کا رواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لیکر آج تک چلا آرہا ہے اور جب تک مسلمان روئے زمین پر ہیں یہ سلسلہ چلتا رہے گا، آج بھی دنیا میں لاکھوں مسلمانوں کو پورا قرآن زبانی یاد ہے، اور ہر سال رمضان کے مہینے میں پورا قرآن تراویح کی نماز میں دہرایا جاتا ہے، اس طرح خدا کا وہ وعدہ کہ "ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، پوری طرح حقیقت بن کر رہا، اور قرآن آج تک اسی طرح باقی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا،

مسلمانوں نے اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ جن کے ہجے اس زمانے میں مختلف تھے، انھیں بھی قرآن میں اس طرح رہنے دیا ہے، اور ان کی اصلاح نہیں کی ہے تاکہ اس کے کسی لفظ یا نقطہ میں بھی تبدیلی یا ترمیم کا شبہ بھی نہ ہونے پائے۔

قرآن کا اعجاز، انداز بیان اور اس کا عربی زبان وادب پر اثر،

قرآن کے مذہبی تقدس اور اہمیت سے قطع نظر کر کے خالص زبان اور ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو شاید یہ پہلا صحیفہ ہے جو عربی زبان وادب میں کتابی شکل میں ابواب، فصلوں اور فقروں کے ساتھ مدون و مرتب ہوا، یمنیوں اور حمیریوں نے بلاشبہ اپنے کارنامے اور بعض اہم واقعات مرتب کیے تھے، لیکن کتابی شکل میں ان کو مرتب کرنے کا ذکر نہیں ملتا، اگر ملتا بھی ہے، تو ان کا وجود نہیں، البتہ ان کی تحریریں پتھروں اور دیواروں پر

کندہ نکلیں ہیں، جن سے ان کی تاریخ کے بعض اہم واقعات پر ایک ہلکی سی روشنی پڑتی ہے[1] اور بس، تمام علماء، مفکرین اور نقادوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان کے اعتبار سے عربوں کا سرمایہ فخر و مباہات ہے، کیونکہ اگر قرآن کا نزول نہ ہوا ہوتا تو عربوں کا نہ ادب محفوظ رہ پاتا اور نہ ان کی کوئی شریعت ہوتی[2]، کیونکہ نہ تو وہ نظم ہے، اور نہ ایسی مسجع نثر، جس کے ہر جملہ کا آخری لفظ اس کے پہلے والے جملے کے آخری لفظ کے ہم وزن اور ہم آواز ہوتا ہے، نہ ہی ایسی نثر مرسل ہے جس میں عبارت سیدھی سادی بغیر قافیہ بندی کے لکھی جاتی ہے، اور نہ ہی اس کا انداز اور اسلوب تقریر یا خطبہ کے انداز و اسلوب سے ملتا ہے، بلکہ وہ نثر کی ایک ایسی منفرد قسم ہے، جس میں نظم اور اعلیٰ معیار کے نثر فنی کے امتزاج سے ایسا اچھوتا اور بے مثال اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے جس میں بعض جگہ مسلسل خوبصورت اور دل آویز مسجع عبارتیں بھی ہیں، اور بعض جگہ رواں عبارتیں بھی، مگر کچھ اس انداز سے کہ جس میں پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ پوری موسیقیت اور پوری شعری نغمگی بھی پائی جاتی ہے، اور پوری نثری سلاست و روانی بھی[3]، اس لئے آج تک کوئی انسان قرآن جیسا اسلوب نہ بنا سکا، اور نہ اس جیسی ایک آیت ہی لکھ سکا اور اسی لئے تخلیق آدم سے لے کر آج تک نسل انسانی کو کوئی دینی یا دنیوی کتاب ایسی میسر نہ آسکی جو قرآن کے اسلوب بیان، اس کے معانی و مطالب کی گہرائی و گیرائی اور اس کی اثر اندازی اور دلوں میں گھر کر لینے کی امتیازی خصوصیت میں اس کا مقابلہ کر سکے، اور یہی امتیاز قرآن کا سب سے بڑا اعجاز اور اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے، اس نے انسان کو تخلیق کائنات، مظاہر قدرت اور انکی رنگا رنگی کی طرف اشارہ کر کے جس مادی اور محسوس طریقۂ استدلال سے ان کے

[1] احمد امین، فجر الاسلام صفحہ ۱۹۲ [2] حاشیہ کرد علی ـ الاسلام والحضارۃ العربیہ ص ۷، اور اسکے بعد

[3] ڈاکٹر شوقی ضیف۔ تاریخ الادب العربی، العصر الاسلامی ۲/۳۰ اور الباقلانی اعجاز القرآن

خالق اور مدبر کے وجود کی طرف سوچنے کی عقل کو دعوت دی ہے، اس کی مثال دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔

اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوات والارض وما خلق اللہ من شئی۔ (اعراف)	کیا انھوں نے آسمانوں اور زمینوں کی پہنائیوں پر اور اللہ نے جو چیزیں پیدا کیں ان پر غور نہیں کیا۔

یا قرآن کا یہ قول کہ

ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ سبحانک (آل عمران)	یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے آنے جانے میں ان عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش پر غور کرتے ہیں کہ اے رب تو نے یہ سب بے کار نہیں پیدا کیا، تیری ذات پاک ہے،

یا اس کا یہ قول کہ

ومن آیاتہ خلق السمٰوات والارض واختلاف السنتکم والوانکم (الروم)	خدا کی نشانیوں میں زمین اور آسمانوں کی پیدائش اور تمہارے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف بھی ہے۔

یا اس کا یہ کہنا کہ

لئن سألتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ[1] (عنکبوت)	اگر آپ ان سے پوچھیں کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ جھٹ بول اٹھیں گے کہ اللہ نے۔

[1] احمد امین، فجر الاسلام۔ ص ۱۴۰

پھر قرآن نے جس انداز سے انسان کو اس کی اپنی تخلیق، اپنے اعضاء و جوارح، اور نظام جسمانی میں ان کے نازک اور اہم کاموں کو سامنے رکھ کر اور ان پر غور و فکر کر کے خالق تک پہونچنے کی دعوت دی ہے، وہ قرآن کا منفرد طریقۂ استدلال ہے، "وفی انفسکم أفلا تبصرون" اور خود تمھارے اندر نشانیاں ہیں، کیا تم کو سجھائی نہیں دیتا یا فلینظر الانسان ممّا خلق" یعنی انسان کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا، یا جس طریقے سے وہ عدم سے وجود میں اشیاء کو لاتا ہے، جس طرح جانداروں کو پیدا کرتا ہے، اور جس طرح مارتا ہے کیا وہ ذات ان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے،

قال من یحیی العظام وھی رمیم — (کافر انسان نے) کہا کون ہڈیوں کو زندہ کریگا جب کہ وہ سڑ

قل یحییھا الذی انشأھا اول — گل گئی ہوں، تم کہدو وہی انکو زندہ کریگا جس نے پہلی مرتبہ

مرۃ وھو بکل خلق علیم (یٰس) — انکو بنایا تھا، وہ ہر قسم کی پیدائش سے واقف ہے،

اور جب قادر ہے تو کیا ان سے ان کے اعمال و افعال کے متعلق باز پرس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟ اگر رکھتا ہے تو کیا اس ذات کے علاوہ کوئی دوسری ذات عبادت و بندگی کے لائق ہے؟ پھر اس نے نسل کو روئے زمین پر ایک بامقصد، مفید اور موثر زندگی گذارنے کے جن طور طریقوں کی نشاندہی کی ہے، اور جن پر عمل کرنے کے بعد دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی، سکون و اطمینان اور راحت ابدی حاصل ہونے کی ضمانت لیتا ہے، اس کا خاصہ ہے اور اس قسم کے دوسرے طریقۂ استدلال کے ذریعہ جس طرح قرآن نے خالق حقیقی اور معبود اصلی تک پہنچنے کی راہیں ہموار کی ہیں، وہ قرآن کے معجز نما انداز بیان اور اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے،

قرآن کریم کی انہی امتیازی خصوصیات کی بنا پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کرتے تھے، تو اس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر آیت، سننے والے کے دل و دماغ میں خواہ آپ کا

دشمن ہو یا دوست اس طرح اترتی چلی جاتی تھی، کہ وہ مسحور ہو جاتا تھا، اور اسکی معجزہ نما قوت بیان سحر طراز طرز استدلال اور بے پناہ اثر اندازی کے سامنے سپر ڈال دیتا تھا، چنانچہ روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ نے جو آپ کا بدترین دشمن تھا، آپ کو قرآن شریف کی بعض آیتیں تلاوت کرتے سنیں تو اتنا متاثر ہوا کہ وہ بھاگا ہوا قریش کے بعض ممتاز سرداروں کے پاس آیا اور بولا کہ

واللہ لقد سمعت من محمد کلاماً — یعنی خدا کی قسم میں نے محمدؐ کو ایسا کلام

ماھو من کلام الانس ولا من — پڑھتے سنا ہے جو نہ تو انسانوں کا کلام

کلام الجن، وان لہ لحلاوۃ وان — ہو سکتا ہے اور نہ جنات کا، اس میں تو

علیہ الطلاوۃ وان أعلاہ — بڑی مٹھاس بڑا بانکپن اور دلکشی ہے،

لمثمر وان اسفلہ لمغدق[1] — اس کا اوپری حصہ (یعنی ظاہر الفاظ) بڑا پھلدار (بڑا سامعہ نواز اور حسین) اور اس کا نچلا حصہ بہت زیادہ پانی والا ہے، (یعنی معانی و مطالب کے اعتبار سے بہت دقیق اور گہرا ہے،)

اسی طرح معلقات کے مشہور شاعر اعشیٰ قیس (۶۲۹ء مطابق ۷ھ) کے متعلق روایت ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر آپ سے ملنے کے لیے حجاز روانہ ہوا تو قریش کے بعض سردار اس سے راستے میں ملے، اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ قرآن کی سحر آفرینی سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائے، انھوں نے اسے ایک سو اونٹ دے کر اس کے وطن یمامہ میں واپس بھیج دیا، اسی طرح مغیرہ بن شعبہ اپنے کان میں روئی ڈال کر

---

[1] تفسیر زمخشری - تفسیر سورۃ المدثر - الطلاوۃ - الحسن والبھجۃ - یعنی دلفریب، من موہنا، خوبصورت

کعبہ کے سامنے سے گزرنا تھا کہ مبادا اس کے کان میں قرآن کی آواز نہ پڑ جائے اور وہ اس سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائے،

حضرت عمرؓ اسلام، مسلمانوں اور آنحضرت صلعم کے اتنے سخت دشمن تھے کہ ایک دن گھر سے نکلے کہ آج آنحضرتؐ کا خاتمہ کر کے رہیں گے، تو اتفاق سے رستے میں ہی کسی نے کہدیا کہ محمدؐ کو تو بعد میں ختم کرنا، پہلے اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو، وہ بھی مسلمان ہو چکے ہیں، چنانچہ اسی شدید غصہ میں بہن کے گھر پہونچے تو قرآن پڑھنے کی آواز آئی، آپ کا پارہ اتنا چڑھا کہ بہن اور بہنوئی دونوں کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا، اور جب خون میں لت پت بہن نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا کہ عمرؓ چاہے جان مار ڈالو، یہ خمار اب اتر نہیں سکتا، تو عمرؓ سناٹے میں آگئے، اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم سے رک گیا، جیسے فالج پڑ گیا ہو، پھر زچ ہو کر بولے کہ اچھا تم کیا پڑھ رہی تھیں، مجھے سناؤ، چنانچہ انھوں نے سورت طٰہٰ کی چند آیتیں پڑھ کر انھیں سنائیں، عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، اور بے اختیار پکار اٹھے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر باقاعدہ مسلمان ہو گئے[۱]، اور یہیں سے خطاب کے اونٹ چرانے والے نوجوان بیٹے کی قسمت محض قرآن کی اثر اندازی کی بدولت بدل گئی بقول اقبال، ؎

تو می دانی کہ سوز قرأت تو — دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

ان واقعات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بیان، طرز تخاطب، طرز استدلال اتنا موثر، دل آویز اور معجز نما تھا کہ جو کوئی بھی سن لیتا اس کے آگے سپر ڈال دیتا، اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ان خصوصیات میں بالکل منفرد و یگانہ ہے، نہ وہ اس زمانے کے ممتاز ادبا اور فصحاء کے کلام سے ملتا جلتا تھا، اور نہ جنوں کی ان بولیوں سے مشابہ تھا، جس کو لوگ اپنے منتروں

۱؎ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کی پوری تفصیل سیرۃ النبی علامہ شبلی نعمانی میں ملاحظہ ہو۔

میں استعمال کرتے تھے، نہ وہ ان اشعار سے ملتا جلتا تھا، جو اس زمانے کے شعراء سناتے تھے، اور نہ ہی کاہنوں اور مفردوں کی زبان سے اسے کوئی مشابہت تھی، بلکہ وہ ان سب سے جدا، منفرد، اور ممتاز چیز تھی، جس کی مثال وہ آپ خود تھا[۱]، اس کا انداز بیان اتنا اچھوتا اور ممتاز تھا کہ قرآن نے عربوں کو چیلنج دیا کہ تم اپنی زبان دانی، اپنی فصاحت و بلاغت پر اتنے نازاں ہو تو قرآن جیسی کتاب لا کر دکھا دو، خود نہ کر سکو تو اپنے ساتھ جنوں کو بھی شریک کر لو، مگر یاد رکھیں اس میں کامیابی نہ ہوگی، پورے قرآن جیسی کتاب تو کیا تم اس جیسی ایک آیت بھی نہیں لا سکتے۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن
علی أن یأتوا بمثل ھذا القرآن
لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم
لبعض ظھیرا۔

آپ (محمد صلعم) ان لوگوں سے کہدیجے کہ انسان اور جنات مل کر بھی قرآن جیسی کتاب لانا چاہیں گے تب بھی انھیں اس میں کامیابی نہ ہوگی، چاہے ان میں سے بعض بعض کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

یہی نہیں، بلکہ اگر تمھیں اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے اور اگر تم سچے ہو تو اس جیسی ایک ہی آیت لا کر دکھا دو، اور اس کام میں خدا کے سوا اپنے ساتھیوں کو بھی شامل کر لو۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی
عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ
وادعوا شھداءکم من دون اللہ
ان کنتم صادقین۔ (بقرہ)

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے بڑے سے بڑے ادیب، اور ممتاز سے ممتاز شاعر اس

۱؎ ڈاکٹر شوقی ضیف۔ تاریخ الادب العربی ۳۰/۲

چیلنج کے آگے بے بس ہو گئے، ان میں سے بعض نے کوشش بھی کی، لیکن ان کی کوشش خود انکی نگاہ میں مضحکہ خیز اور بھس دکھائی دینے لگی۔

اس طرح کی کوشش کرنے والوں میں مورخین نے سات آٹھ اشخاص کا ذکر کیا ہے جن میں مسیلمہ کذاب کا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور سجاح بنت الحارث بن السوید کا جو عورتوں میں پہلی مدعیۂ نبوت تھی، اور جس نے بعد میں مسیلمہ سے شادی کر لی، خاص طور سے ذکر کیا ہے اور ان کے بقول ان پر نازل شدہ آیات بھی لکھی ہیں، جو بھس اور بے معنی اور انتہائی مضحکہ خیز ہیں، مدعیان نبوت کے علاوہ ادبا اور شعراء میں مشہور شاعر ادیب اور فلسفی ابو العلا المعری کا بھی ذکر کیا ہے، کہ انھوں نے قرآن جیسی عبارت لکھنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہے،[1]

جب اس طرح عربوں کو قرآن کا تحریری مقابلہ کرنے میں ذلت آمیز ناکامی ہوئی تو انھوں نے اب اپنی زبانیں بند کر لیں، اور تلواریں میان سے نکال لیں، لیکن یہ قرآن ہی کا اعجاز تھا، کہ باوجود سخت مخالفت اور متعدد خونریز لڑائیوں کے اسلام کے سیل رواں کو کوئی روک نہ لگا سکا، اور اور اس کا ڈنکا آنحضرت صلعم ہی کے زمانے میں نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں بجنے لگا، بلکہ اس کے اثرات دور دور تک پھیل گئے، اور بعد میں تو قرآن کا غلغلہ مشرق میں ہندوستان تک، مغرب میں بحر اٹلانٹک کے ساحلوں تک، شمال میں دریائے لورا کے کناروں تک اور جنوب میں وسطی افریقہ تک بلند ہونے لگا،

جیسا کہ معلوم ہے، عرب قبائل عام طور سے معمولی باتوں پر آپس میں لڑ جاتے تھے، اور ان لڑائیوں کے سلسلے ایک مدت دراز تک چلا کرتے تھے، قرآن نے نازل ہو کر سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کے

---

[1] ایسے لوگوں کی پوری فہرست اور تفصیل کے لیے دیکھئے۔ الکامل للمبرد ۲/ ۱۱۱ اور مصطفیٰ صادق الرافعی تاریخ ادب العرب مطبوعہ الاستقامۃ۔ القاہرہ، ۲/ ۱۸۴ سے جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۲/ ۲۱۵ مطبوعہ دار الہلال مصر مراجعۃ و تعلیق ڈاکٹر شوقی ضیف۔

اختلافات کو ختم کر کے ان سب کو بھائی چارگی کے رشتہ میں پرو دیا، اور اس طرح آنحضرت صلعم کے قول کے مطابق المسلمون اخوۃ سب بھائی بن گئے، اس طرح یہ قبائل مختلف لہجوں میں گفتگو کرتے تھے بلکہ یمنیوں کی زبان تو حجازیوں کی زبان سے اتنی مختلف تھی کہ کہیں سے تال میل معلوم ہی نہیں ہوتا تھا، قرآن نے لہجہ قریش میں نازل ہو کر یہ تاریخی کارنامہ انجام دیا کہ تمام لہجوں کو ختم کر کے زبان کے معاملے میں بھی لہجۂ قریش پر سب کو اس طرح متحد و متفق کر دیا کہ اب سارا عرب اسے اسی لہجہ میں تلاوت کرنے لگا، اور اسی لہجہ میں زبانی یاد کرنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سارے لہجے ختم ہونے لگے، اور آخر میں شعر و ادب کی زبان بھی قریشی لہجہ بن گیا، اور یہ قرآن کا وہ اعجاز ہے، جس کی مثال کسی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتی زبان و ادب کے اس اتحاد کے بعد قرآن نے ان عربوں کو جو سیاسی وحدت اور ملی یگانگت کے مفہوم تک کو نہیں سمجھتے تھے، بقول دان کریمر مختلف قبیلوں کو ایک مشترک دین کے شعور کے ساتھ ساتھ ایک واحد قیادت کے سہارے ایک ہی سیاسی نظام میں پرو دیا، اور اس طرح وہ قبائلی نظام جو بالکل تو ختم نہ ہو سکا، لیکن پہلی مرتبہ اس کو دینی وحدت کے مقابلے میں ثانوی حیثیت ملی (سر تھامس آرنلڈ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ "الدعوۃ الی الاسلام ص ۵۳)

قرآن اور اس کے انداز بیان کا زبان و لغت پر یہ خاص اثر ہوا کہ اس نے عربی زبان میں ایک خاص قسم کا انفرادی تقدس پیدا کر دیا جس کی مثال کسی دوسری زبان میں مشکل سے ملے گی اور وہ اس طرح کہ اس نے نہ صرف نئے الفاظ وضع کئے اور ان کے معنی متعین کئے، بلکہ بعض پرانے الفاظ کے معانی و مطالب کو وسعت و گہرائی دی، اور بعض کے معنی بدل کر نئے معنی پہنائے جیسے فرقان، کفر، ایمان، شرک، نفاق، اسلام کہ ان الفاظ کو مخصوص معنوں میں استعمال کرنے کا سہرا قرآن ہی کے سر ہے، اور اسی طرح یہ الفاظ جو پہلے سے عربی میں موجود تھے، لیکن نئے اور مخصوص معنوں میں عربی زبان میں بالکل نئے الفاظ کی طرح شامل ہوئے، اور ان کے معنی پہلے سے رائج شدہ

مستقل معنوں سے بالکل مختلف ہو گئے، مثلاً لفظ "صلوٰۃ" جس کے معنی عربی میں صرف "دعا" کے ہیں
لیکن قرآن کریم نے اسے مسلمانوں کے مخصوص طریقۂ عبادت کے لئے متعین کر دیا، اب لفظ صلوٰۃ
کسی دوسرے مذہب کی عبادت کو نہیں کہہ سکتے، یا لفظ "صوم" جس کے لغوی معنی کسی کام سے
رک جانا کے ہیں، لیکن قرآن نے اسے مخصوص طریقہ اور چند قیود و شرائط کے ساتھ کھانے پینے اور
بعض دیگر انسانی ضروریات سے صبح صادق سے لے کر سورج ڈوبنے تک رکے رہنے کے لئے مخصوص
کر دیا ہے جسے ہم روزہ کہتے ہیں، یا لفظ "زکوٰۃ" جس کے لغوی معنی صرف "پاک و صاف" کرنے کے
ہیں، مگر قرآن نے اسے اس ٹیکس کے لئے مخصوص کر دیا ہے، جسے مسلمانوں کو اپنے مال و دولت پر
ہر سال دینا پڑتا ہے، اسی طرح مومن، کافر، فاسق، وغیرہ کے الفاظ ہیں، جن کے معنی قرآن نے
متعین کر کے ان کے معنی میں وسعت و گہرائی کے علاوہ ایک دینی رنگ دے دیا، چنانچہ اب انکے
مخصوص اصطلاحی معنی متعین ہو گئے، جو کسی دوسرے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتے۔

قرآن کریم کی بدولت عربی زبان میں بہت سے نئے علوم کا وجود ہوا، جیسے اس کی تشریح و توضیح
کے لیے علم تفسیر اور اصول تفسیر پیدا ہوا، اس کے معنی و مطالب کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے علم نحو و صرف
پھر علم بیان و بلاغت و بدیع اور اس سے مسائل نکالنے (استنباط کرنے) کی غرض سے علم فقہ، علم
فرائض یا وراثت اور اس کے مختلف مباحث کے اثبات و تحقیق کے لیے علم کلام اور دوسرے فنون
ایجاد کئے گئے۔

قرآن کو خوبصورتی سے لکھنے کی غرض سے فن کتابت پیدا ہوا، اور اس کے اتنے نمونے نکلے کہ
کسی دوسری زبان میں کتابت و طرز تحریر کے اتنے نمونے نہیں مل سکتے مسلمان خطاطوں نے
اس فن کو اتنی بلندی بخشی اور اس میں اتنا تنوع، اتنا حسن اور اتنا بانکپن پیدا کیا جس نے فنون
لطیفہ کے دوسرے اصناف میں ان کی کوتاہ دستی کی کمی کو پورا کر دیا۔

قرآن کی بکثرت تلاوت کرنے، پانچوں وقت کی نمازوں میں اس کی آیات پڑھنے، ان سے
مسائل اور احکام نکالنے (استنباط) کی غرض سے ان پر غور و فکر کرنے اور ان کے معانی و مفہوم
کو سمجھنے کی وجہ سے اس کا اسلوب بیان، اس کے تشبیہہ و استعارے، اس کا انداز تخاطب، انداز
تذکیر و تحذیر، ادبأ، شعرأ، علمأ اور متکلمین کی زبانوں پر چڑھ گیا، اور بعد میں ان کی انشا و ادب کا
جزبن گیا، چنانچہ اصحاب علم و فن اس کی تقلید کر کے اس کی آیتوں کو بطور استدلال پیش کر کے اپنی
تحریر، تقریر اور شعر و شاعری کو ادب کا مرقع اور فن کا شہ پارہ بنانے لگے اور آج تک قرآن کی یہ
امتیازی شان بدستور باقی ہے، اور آخر میں قرآن ہی کی زبان عربی تمام مفتوحہ اسلامی ملکوں کی
سرکاری زبان بھی بن گئی۔

زبان و ادب پر قرآن کے ان اثرات کے علاوہ اس کی بدولت زمانۂ ماقبل تاریخ کی
بعض گتھیاں سلجھانے میں بڑی مدد ملی، اور ایک ایسا علم وجود میں آگیا جو شاید پہلے نہ تھا، اور وہ تھا
علم آثار قدیمہ، توراۃ اور انجیل میں بعض پرانے نبیوں اور پرانی بھولی بسری قوموں کے واقعات اور
ان کے قصوں کا ذکر بہت اجمال کے ساتھ آیا ہے، جنھیں بعد کے لوگوں نے اور بھی مسخ کر دیا تھا،
ان میں سے بعض قصوں کو علمائے یہود و نصاریٰ سطحی اور مسخ شدہ حالت میں جانتے تھے لیکن
کوئی قطعی اور واضح بات ان کے ذہن میں ان کے متعلق نہ تھی، قرآن نے پہلی بار بعض جگہ تفصیلی
اور بعض جگہ اشارۃً ان پر روشنی ڈالی، ان قوموں میں عاد و ثمود، اصحاب کہف و رقیم، فراعنۂ مصر
اہل بابل و نینوئی اور دوسری قومیں ہیں، جن کا ذکر پچھلی کتابوں میں تھا لیکن اس طرح تھا کہ انکی کوئی
واضح شکل سامنے ابھر کر نہ آئی تھی، کہ کہاں تھیں، کیسی زندگی گزاری اور پھر ان کا انجام کیا ہوا،
قرآن نے نازل ہو کر عبرت و موعظت کے خیال سے ان کی زندگی پر پڑے دبیز پردوں کو اٹھایا
اور ان کی اصلی شکل دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ پیش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کے شروع میں

جب آثار قدیمہ کے علماء نے تاریخ کے ان اہم ابواب کی تلاش و جستجو میں زمین کے سینے سے حقائق نکالنے کی کوشش شروع کی تو قرآن کو اُن آیات سے بڑی مدد ملی، اور انھوں نے مختلف عرب ممالک میں کھدائیاں کر کے بہت سا قیمتی ذخیرہ جمع کر لیا ہے، جس سے ان قوموں کی زندگی کے بعض بھولے بسرے گوشے واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں، اور تاریخ کے بہت سے کٹے ہوئے سلسلے اور ٹوٹی ہوئی کڑیاں پھر سے جڑ گئی ہیں،[1]

غرض کہ قرآن نے اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف عربی زبان کو دوسری سامی زبانوں کی طرح مٹنے سے بچا لیا، بلکہ مختلف لہجوں اور بولیوں کو ختم کر کے ایک ایسی خوبصورت میٹھی دلنشین، موثر اور گٹھی ہوئی زبان کو جنم دیا جو سب عربوں کو متحدہ اور متفقہ زبان بن گئی، اور بعد میں جس کا دامن اتنا وسیع ہوا کہ علم و فن کے لئے بحر بیکراں بن گئی، پھر بھی قرآن اسکی کسوٹی بنا، اور آج تک اس کا یہ امتیاز باقی ہے، اور جب تک عربی زبان زندہ، اور روئے زمین پر ایک مسلمان بھی باقی ہے، ہمیشہ رہے گا۔

---

[1] ان کھدائیوں اور ان کے نتیجہ میں برآمد شدہ آثار کا ذکر عربی ادب کی تاریخ، مصنفہ مضمون نگار کی پہلی جلد کے ص ۷، ۲۰، ۲۶ سے ۳۰ تک کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ارض القرآن

حصہ اول میں عرب کے قدیم جغرافیہ کے بعد عاد ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ قرآن کی روشنی میں اسطرح لکھی گئی ہے، کہ تمام متمدن قوموں کے لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے اسکی تائید و تصدیق ثابت ہوتی ہے۔ قیمت ۱۳ روپے

حصہ دوم، میں مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب بنو اسمٰعیل، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انباط اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت زبان، اور مذہب پر تفصیلی بحث کی گئی ہے، قیمت ۱۰ روپے، (مولف۔ مولانا سید سلیمان ندوی)

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنجشکرؒ

کے

مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیا کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی

اسرار الاولیاء (فارسی نسخہ) مطبوعہ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء (بار ششم) مطبوعہ مطبع نولکشور کانپور، حجم ۹۴ صفحات سائز ۲۰×۱۰ مسطرہ ۲۵ سطری قلم خفی، اس کتاب میں حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات ہیں، جو بائیس ۲۲ فصلوں پر مشتمل ہیں، ہر فصل کا عنوان جداگانہ ہے، اس کے جامع مولانا بدرالدین اسحاقؒ ہیں، جو حضرت بابا صاحبؒ کے خلیفہ و داماد اور حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں ہمہ وقت کے حاضر باش تھے،

اسرار الاولیاء کی قدامت عہد مغلیہ کے شہرۂ آفاق عالم و درویش اور مسلم الثبوت اہل قلم شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۰۵۱ھ / ۱۶۴۱ء) مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے احوال میں لکھتے ہیں،

وے را رسالہ ایست مسمیٰ اسرار الاولیا کہ در وے ملفوظاتِ گنجشکرؒ را جمع کردہ در علم تصریف کتابے نظم کردہ است[1]	ان کا ایک رسالہ ہے جسکا نام اسرار الاولیاء ہے جس میں انھوں نے حضرت باباؒ کے ملفوظات جمع کئے ہیں، علم صرف میں ایک کتاب نظم کی

---

[1] انوار الفریدی ص ۱۰، مطبوعہ پاکستان میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس میں جو کتابیں نصاب میں داخل تھیں ان میں سے کئی کتابیں حضرت مولانا کی تصنیف تھیں، یہ بیان خلاف تحقیق غلط بلکہ افترا ہے۔ (بقیہ حاشیہ ص ۳۵۶)

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم نے مولانا بدر الدین اسحاقؒ کے ذکر میں لکھا ہے،

کتاب اسرار الاولیاء از تصنیف وے است	کتاب اسرار الاولیاء ان کی (مولانا بدر الدینؒ
(خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ ص ۳۱۹)	اسحاق کی تصنیف ہے،

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم نے امیر خورد کرمانیؒ کے نقد مین یہ بھی لکھا ہے،

درین خاندان دو کتاب بنام سیر الاولیاءؒ	اس خاندان میں سیر الاولیاء نام سے
معروف و مشہور است، یکے تالیف مولانا	دو کتابیں معروف و مشہور ہیں، ایک
بدر الدین اسحاقؒ کہ از ملفوظات خواجہ	مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی تالیف ہے
فرید الحق والدین جمع آوردہ است	جس میں حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جمع
دوم سیر الاولیاء تالیف سید محمد بن	کیے ہیں، دوسری سیر الاولیاء، سید محمد بن مبارک
مبارک کرمانی رحمۃ اللہ علیہ	رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے،

(خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ ص ۳۶۶ نولکشوری)

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم کے بیان سے معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ سیر الاولیاء نامی کوئی کتاب مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی تالیف بھی ہے، جو حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ جو اسرار الاولیاء کے علاوہ ہے، جس کا ذکر انھوں نے مولانا بدر الدین اسحاقؒ کے احوال میں کیا ہے مگر نہ تو مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم ہی نے متذکرہ سیر الاولیاء کا ذکر مولانا بدر الدین اسحاقؒ کے احوال میں کیا ہے، اور نہ کسی اور نے، ممکن ہے کہ مغالطہ ہوا ہو، یہ کتاب سیر الاولیاء تالیف مولانا بدر الدین اسحاقؒ ہمارے مطالعہ میں بھی نہیں آئی، اس لئے ہم اس کے متعلق اظہار خیال سے معذور رہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۵) مولانا موصوف سے منسوب صرف دو ہی کتابیں ہیں جن کا ذکر قدما کی کتابوں میں ملتا ہے (۱) اسرار الاولیاء (۲) علم صرف میں منظوم رسالہ جن کا نصاب تعلیم میں داخل ہونا ثابت نہیں،

کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء تالیف مولانا رکن الدین عماد کاشانیؒ کی فہرست ماخذات میں اسرار المتحیرین نامی ایک کتاب ہے، جو حضرت بابا صاحبؒ ہی کے ملفوظات پر مشتمل ہے، جو نایاب ہے، مولف کا نام بھی نہیں لکھا ہے، ممکن ہے متذکرہ سیر الاولیاء سے مراد یہی کتاب ہو، تاہم فی الحال وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت خواجہ غلام فرید چشتیؒ (المتوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء)، جو عہد ماضی قریب کے ممتاز ترین مشائخ میں تھے، جن کی عالمانہ اور درویشانہ شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، ان کے ملفوظات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ علوم و فنون سے انھیں کمال آگاہی تھی، وہ فرماتے ہیں :۔

بدر الدین اسحاق قدس اللہ سرہٗ جو اسرار الاولیاءؒ کے جامع ہیں، ان کا ضبط تاریخ والفاظ اس قدر پختہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے شیخ شیوخؒ کی زبان درفشاں سے سنا اسی طرح لکھ دیا۔ اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے (مقابیس المجالس ص ۳۶۵ ترجمہ)

مقابیس میں یہ اُن جلیل القدر بزرگ کا بیان ہے، جو علم و فضل اور بصیرت باطنی سے مالا مال تھے۔ اس بیان سے یہ مترشح ہے کہ موصوف کے زیر مطالعہ اسرار الاولیاء کا کوئی مستند و معتبر نسخہ تھا، جس کی صحت پر انھیں کامل بھروسہ تھا، شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کا بیان نقل کیا جا چکا ہے۔ وہ نہایت درجہ ثقہ اور باکمال بزرگ تھے، یقیناً ان کے پیش نظر بھی اسرار الاولیاء کا کوئی قدیم و مستند نسخہ تھا، ممکن ہے کہ وہ قدامت کے جملہ اوصاف سے متصف ہو، تاہم شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ جیسے باکمال بزرگ سے متعلق اس بدگمانی کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے کہ

[1] مقابیس المجالس ص ۳۴۶ (ترجمہ) میں اسرار الاولیاء اور راحت القلوب دونوں ہی کا ذکر ہے، اس کے حاشیے میں مترجم نے خواجہ موصوف کے مقابلے میں خیر المجالس اور جوامع الکلم کی بے صرفہ اور الحاقی عبارتیں نقل کر کے حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے مبارک بیان کی تردید کی ہے، جو نہایت درجہ غلط اور شرمناک ہے،

وہ کسی نوموبو نسخے کو مولانا بدر الدین اسحاقؒ سے منسوب فرماتے جو اصول تصوف اور تعلیمات اسلامی کے خلاف مضامین پر مشتمل ہوتا، وہ اصول تصوف سے بھی بہرہ کامل رکھتے تھے، اور تعلیمات اسلامی سے بھی، اگر کم علمی اور بے احتیاطی کا شائبہ بھی پاتے تو بلاشبہ ان کی حق گوئی ہرگز اس کے اظہار میں تامل نہ کرتی۔

سات سو برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے ہزارہا علمائے مشائخ اور صوفیائے کرام گزرے ہیں، ان بزرگوں کے جو ملفوظات دستیاب ہوتے ہیں، ان سے واضح ہے کہ ان حضرات نے بھی اسرار الاولیاء سے استفادہ کیا ہے، اور روگردانی نہیں فرمائی ہے یہ بھی ہے، کہ دستیاب شدہ کتب ملفوظات میں قدامت کے اعتبار سے جو فوقیت نسخۂ اسرار الاولیاء کو حاصل ہے وہ اور کسی کو حاصل نہیں، کتب ملفوظات کے جو قدیم ترین نسخے ہندوستان کے مشہور و معتبر کتب خانوں (لائبریریوں) میں محفوظ ہیں، ان میں سب سے قدیم نسخہ اسرار الاولیاء ہی کا ہے، جو ۱۰۰۸ھ (دس سو آٹھ ہجری) کا مکتوبہ ہے اور جو مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا) کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت ہے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر اعتبار سے اسرار الاولیاء کا قدیم و مستند ہونا اور مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی تالیف ہونا ثابت ہے، حتیٰ کہ داخلی شواہد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، البتہ عصری حالات کی اثر اندازی سے اور الحاق و تحریف سے مبرا ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اس سے کسی قلمی کاوش کو مفر نہیں ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ سے آراستہ کر کے اسرار الاولیاء کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ متدین معاشرہ کو اور دینی و اخلاقی اور صوفیانہ قدروں کو از سر نو رواج عام نصیب ہو اور طالبان حق کی تشنگی رفع ہو۔

جوامع الکلم کا بیان — خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نوازؒ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلفاء میں

نامور شخصیت کے مالک گزرے ہیں، اُن کے سوانح حیات سے واضح ہے کہ وہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی وفات (۷۵۷ھ) کے بعد عتبات عالیات کی زیارت کرتے ہوئے دہلی سے دکن تشریف لے گئے تھے، گلبرگہ میں قیام فرما ہوئے اور وہیں (۸۲۵ھ) میں انتقال ہوا، مزار پر انوار گلبرگہ ہی میں ہے، اور مرجع خلائق ہے۔

اس سفر کے دوران خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ حضرت باباصاحبؒ کے مزار پُر انوار کی زیارت کو بھی گئے تھے، جوامع الکلم کی ایک ژولیدہ عبارت یہ بتاتی ہے کہ قیام اجودھن (پاک پٹن) میں انھوں نے ایک مجموعۂ ملفوظات دیکھا تھا، جسے بعض مولانا بدر الدین اسحاقؒ کا مرتبہ بتاتے تھے، اور بعض کو اس سے انکار تھا، جوامع الکلم کی مشمولہ عبارت یہ ہے:۔

ملفوظے ازان شیخ فرید الدین در اجودھن دیدم کہ آن را نسبت بہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ می کنند سر بسر ہمہ افترا است. می گویند کہ جمع کردہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ نیست (جوامع الکلم ص ۱۳۴)	میں نے اجودھن میں شیخ فرید الدین کا ایک ملفوظہ دیکھا ہے، جسے مولانا بدر الدین اسحاقؒ سے منسوب کرتے ہیں، وہ تمام تر بہتان ہے، کہتے ہیں کہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ کا جمع کیا ہوا نہیں ہے۔

اس بیان کا اسلوب حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے دیگر بیانات سے مختلف، مشتبہ، مذبذب اور مبہم ہے، یہ نہیں کھلتا کہ سر بسر ہمہ افترا کس سے متعلق ہے، ملفوظے سے متعلق ہے یا نسبت سے، اگر دونوں ہی سے ہے تو پھر می گویند جمع کردہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ نیست کیا ہے مانا کہ یہ حشو ہے، جس سے ابتدائی جملوں کا مفہوم مشتبہ اور مبہم ہو گیا ہے، اور یہ استفہام بتانے ہے کہ یہ جملے حضرت خواجہ گیسو درازؒ جیسے باکمال انشا پرداز کے نہیں ہو سکتے بلکہ کسی ایسے شخص کے نوشتہ

ہیں جو انشاء میں کامل دسترس نہیں رکھتا تھا، یہی کیفیت ان عبارتوں کی ہے، جو سیر الاولیاء اور خیر المجالس میں الحاق کی گئی ہیں اور ایسے ہی اسقام سے الحاقی عبارتیں گرفت میں آتی ہیں، البتہ ذوق سلیم اور ادب و انشاء میں دسترس درکار ہوتی ہے،

بہر حال اس مبہم و مشتبہ عبارت سے جو نکات بر آمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں،

(۱) ایک صدی کے اندر ہی اندر مولانا بدرالدین اسحاق کے تالیف کردہ مجموعہ ملفوظات کا ذکر مل جاتا ہے، اور یہ پتہ چلتا ہے، اس عہد کے خواندہ حضرات اس سے باخبر تھے، یہ علاحدہ بات ہے بقول غالب۔ ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

پھر خواہ اسرار الاولیاء کا صحیح نسخہ دستیاب ہو سکا تھا یا نہیں مگر اس کے وجود کی نشان دہی ہوتی ہے، جس سے معقولیت کے ساتھ انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اس بیان سے یہ بھی علم میں آتا ہے کہ اجودھن (پاکپٹن) میں مختلف الخیال دو گروہ تھے، ایک اس کا قائل تھا کہ مولانا بدرالدین اسحاق نے حضرت باباصاحب کا مجموعۂ ملفوظات تالیف کیا تھا، جو بقولہ مسخ شدہ صورت میں دستیاب ہو سکا تھا۔ دوسرا گروہ منکر تھا، جو کہتا تھا کہ جمع کردہ مولانا بدرالدین اسحاق نیست یعنی متذکرہ مسخ شدہ نسخہ ملفوظات مولانا بدرالدین اسحاق کا جمع کردہ نہیں ہی مگر اس سے انکار نہیں کہ انھوں نے حضرت باباصاحب کا مجموعہ تالیف فرمایا تھا،

(۳) امیر خورد کرمانی کے بیان سے بھی یہ ثابت ہے کہ اجودھن (پاکپٹن) میں ایک گروہ ایسا تھا ایسا تھا جو مولانا بدرالدین اسحاق سے عناد رکھتا تھا، اسی کی سازش سے شیخ بدرالدین سلیمان اور مولانا بدرالدین اسحاق کے درمیان کشیدگی ہوئی تھی، اور مولانا بدرالدین اسحاق نے جامع مسجد اجودھن میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

شیخ بدرالدین سلیمان حضرت باباصاحب کے سنجھلے صاجزادے تھے، جو بھائیوں کے مشورے سے اور بعض عقیدتمندوں کے مشورے سے حضرت باباصاحب کے سجادہ نشین بنے تھے، مولانا بدرالدین اسحاق ان کی خدمت بھی اسی طرح کرتے تھے جس طرح حضرت باباصاحب کی کیا کرتے تھے مگر حاسدوں کا وہ گروہ جو منصب خادمی یا بالفاظ دیگر قرب شیخ کا طالب تھا وہی مولانا بدرالدین اسحاق کا مخالف تھا، اور اسی کی سازش سے ان بزرگوں کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہوئی تھی، امیر خورد کرمانی لکھتے ہیں،

حاسدان میان شیخ بدرالدین سلیمان	حاسدوں نے شیخ بدرالدین سلیمان اور
ومیان خدمت مولانا بدرالدین اسحاق	مولانا بدرالدین اسحاق کے درمیان
القاء عداوت کردند وخواستند کہ	کشیدگی کرادی تھی اور وہ یہ چاہتے تھے
منصب خادمی خود فرو گیرند، خاطر مبارک	کہ خادمی (قرب شیخ کا منصب) وہ حاصل
خدمت مولانا بدرالدین اسحاق بدین سبب	کریں مولانا بدرالدین اسحاق کی مبارک
منغص شد . . . . . خدمت مولانا	طبیعت ان حالات سے مکدر ہوئی . . . .
. . . . در مسجد جمعہ آمد و نشست	. . . لہذا حضرت مولانا بدرالدین اسحاق نے
(سیر الاولیاء ص ۱۸۱ ج ۱)	(کنارہ کشی اختیار کی) اور . . . . جامع مسجد
	میں اقامت اختیار کر لی۔

اس کشیدگی کی تلخی مولانا بدرالدین اسحاق کی وفات کے بعد بھی برقرار رہتی محسوس ہوتی ہے، کہ ناساعد حالات سے مجبور ہو کر مولانا بدرالدین اسحاق کی بیوہ جو حضرت باباصاحب کی چھوٹی صاجزادی تھیں گھربار کو خیرباد کہہ کر دونوں یتیم بچوں سمیت دلی چلی آئی تھیں، اور تا حیات وہ دلی ہی میں رہیں اور حضرت محبوب الٰہی کی کفالت میں رہیں، اور ان کے بعد ان کے دونوں بچوں نے حضرت محبوب الٰہی کی سرپرستی میں پرورش پائی، اور پروان چڑھے، بلاشبہ حضرت محبوب الٰہی حضرت باباصاحب کے

اصلی جانشین تھے، مگر فردِ خاندان یا محرم نہیں تھے، اس سے شدید کشیدگی اور کیا ہوگی کہ اللہ والوں میں صلہ رحمی کا فقدان نظر آنے لگے۔ ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

(۴) قیام اجودھن (پاکپتن) میں جس مجموعۂ ملفوظات کا دیکھنا بتایا گیا ہے (ملفوظ ازاں شیخ فرید الدینؒ) اس کے متعلق یہ بتانا تھا کہ نام اس کا کیا تھا، وہ نسخہ اسرار الاولیاء تھا یا کوئی مجموعہ اور تھا، کتنا حجم تھا، کب کا مکتوبہ تھا، اور اس میں جو ملفوظات تھے، جنھیں حضرت باباصاحبؒ سے منسوب بتایا ہے، وہ کیا تھے، کیسے تھے، اور کیوں سر بسر ہمہ افترا کی حد میں تھے، خواہ وہ بے سروپا حکایات کا مجموعہ ہی سہی تاہم یہ بتانا ضروری تھا کہ وہ تھے کیا، جنھیں سر بسر ہمہ افترا کہا گیا ہے کیونکہ ع

دعویٰ بلا دلیل قبولِ خرد نہیں

یہ بھی حیرت انگیز ہے کہ اجودھن (پاکپتن) ہی میں ایسا مجموعۂ ملفوظات حضرت باباصاحبؒ سے منسوب دکھانے کی جسارت کی جائے جو سر بسر ہمہ افترا کی حد میں داخل ہو، جہاں حضرت باباصاحبؒ کی تعلیمات سے دل و دماغ متاثر تھے، وہ کون ہو سکتا ہے جو ایسا از کار رفتہ مجموعۂ ملفوظات دکھا سکتا تھا۔

الغرض یہ بیان نہایت درجہ مبہم اور بہ نہایت از کار رفتہ ہے، اس میں حضرت باباؒ کو ایک نامی کی نسبت یاد کیا گیا ہے (ملفوظ ازاں شیخ فرید الدینؒ) جو نظرِ عقیدت میں وقیع نہیں، حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے شیخ محترم مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے بھی کبھی اس طرح یاد نہیں فرمایا ہے، ان کی مبارک زبان پر جب حضرت باباصاحبؒ کا نام نامی آیا ہے کمال ادب و احترام سے آیا ہے، جو مشرقی تہذیب کا خاصہ ہے، آیندہ کا نقاد بتائے گا کہ یہ چیستان ہے کیا اور اس بیان کا ادب و انشا میں کیا مقام ہے، صدیاں گزر گئیں، اہل علم میں سے کوئی بھی اس عبارت سے متاثر نہیں، نہ اس کے سہارے کسی نے اسرار الاولیاء کو ناقابلِ اعتنا قرار دیا ہے بلکہ معروف ہے کہ ضبط الفاظ اس قدر پختہ ہے کہ

بعینہٖ حضرت باباصاحب کا بیان معلوم ہوتا ہے، البتہ چودہویں صدی کے ربع آخر میں ایسے اشخاص جو ادب و انشا کی نزاکتوں سے نا آشنا ہیں، وہ اس عبارت کے سہارے اسرار الاولیاء کو جعلی بتانے لگے ہیں۔

(۵) جس نسخۂ ملفوظات کا ذکر متذکرہ عبارت میں ہے، اور جو سر بسر ہمہ افترا کی حد میں شمار ہو، وہ کیا تھا، اس کا آج بھی کسی کو علم نہیں ہے، مگر اسرار الاولیاء کے دستیاب ہونے والے نسخے پر آج بھی سر بسر ہمہ افترا کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ اسرار الاولیاء کا متداول نسخہ اصولِ شریعت و طریقت کے بالکل مطابق ہے اور صحیفۂ رشد و ہدایت ہے، اور اس کی روایات پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ سطحی ہیں۔

متذکرہ بیان جسے حضرت خواجہ گیسو درازؒ سے منسوب کیا گیا ہے، اور جو فی الواقع ان کا نہیں ہے، اور جو نہایت درجہ مبہم مشتبہ اور مذبذب ہے اور جس سے صحیح نقطۂ نظر واضح نہیں ہوتا، ہرگز قابل قبول نہیں ہے بلکہ اس کو حضرت خواجہ گیسو درازؒ سے منسوب کھلا افترا بھی ہے، اور جب کبھی کوئی صاحب کمال جوامع الکلم پر لکھے گا تو پوست کندہ کیفیت سامنے آجائے گی۔

جوامع الکلم حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا مجموعۂ ملفوظات ہے، جسے ان کے صاحبزادے سید محمد اکبر حسینیؒ نے مرتب فرمایا تھا، جو تمام تر دس ماہ کا مجموعۂ ملفوظات ہے، (۱۶ رجب ۸۰۲ھ تا ۲۲ ربیع الثانی ۸۰۳ھ) اس پر یہ اعتراض بھی ہے، اس کے بعض بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ مائل بشیعیت تھے[1] مگر اس خیال کی تردید[2] جوامع الکلم کے دیگر بیانات سے ہو جاتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے اور افسوس ناک واقعہ ہے کہ جوامع الکلم میں متعدد ایسی روایتیں ہیں کہ شرم و حیا سے آج بھی کوئی مہذب باپ اپنے بیٹے کے سامنے بیان نہیں کر سکتا،

---

[1] مجلس منعقدہ ۵ رمضان ۸۰۲ھ مجلس منعقدہ ۱۰ رمضان ۸۰۲ھ جوامع الکلم مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ

[2] آغاز ہی میں ہے، افضل صحابہ ابوبکرؓ ثم عمرؓ ثم عثمانؓ ثم علیؓ

کتنی ہی ایسی روایتیں ہیں جن سے بمشکل ہی کوئی اچھا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، کتنی ایسی ہیں جن سے
متدین اور نیکوکار اشخاص کی شخصیت مجروح نظر آتی ہے حتیٰ کہ خواجہ اقبال تک بد دیانتی
سے ملوث نظر آتے ہیں، جو بچپن سے بڑھاپے تک حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں رہے تھے،
اور خادم خاص کے منصب پر فائز تھے، بلکہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ذات گرامی بھی ملوث
دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ اگر الحاق و تصرف نہیں ہے، اسی طرح ملفوظات کے متعلق جو کچھ
ہے وہ بھی الحاق و تصرف ہی ہے، اور وہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا بیان نہیں ہے،

تاریخی اندراج | کتب دینیات ہوں یا کتب تصوف اُن میں تاریخی اندراج کی نہ کچھ اہمیت تھی
اور نہ عہد قدیم میں اس کا رواج و اہتمام تھا، چنانچہ متعدد کتابیں اس وصف سے معرا ملتی ہیں،
غالباً اسرار الاولیا، پہلا مجموعۂ ملفوظات ہے جس کے آغاز میں ایک تاریخی اندراج ہے جو غلط اور محرف
ہے، غلطی کا سبب کاتبوں اور ناقلوں کا سہو بھی ہو سکتا ہے، ورنہ تحریف و الحاق کرنے والوں کی کارستانی ہے،

نقاد ہو یا محقق یا سوانح نگار تاریخی اندراجات سے کام لینے سے پہلے اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ
تاریخی اندراجات کو خوب اچھی طرح کسوٹی پر کس لے۔ اگر صحیح ہیں تو فہو المراد اور اگر غلط ہیں ان کو بے تکلف
مسترد قرار دے اور تحقیق سے صحیح تاریخی تعین کی کوشش کرے اور ہرگز غلط تاریخی اندراج کو محور نہ بنائے
ورنہ کیا دھرا سب اکارت جائے گا، سنین کے اندراجات میں اکثر غلطیاں ہوئی ہیں۔ خواہ نقل و کتابت

۱؎ جوامع الکلم مجلس منعقدہ رجب ۰۰۰۰، شعبان ۹-۱۲-۱۹-۲۲-۲۵-۲۷-۲۹-۳۰ - رمضان ۱-۳-۵-
۱۲-۲۲-۲۳ شوال ۳ ......

۲؎ اس مضمون کے تحریر کے دوران اتفاق سے گلبرگہ شریف کے معزز صحافی جناب
عبدالحکیم صاحب ملاقات کو تشریف لائے، دوران گفتگو میں جوامع الکلم کا ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ جب جوامع الکلم گلبرگہ شریف سے
شائع ہوئی تو ہنگامہ ہوا اور اس کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا، اور یہ نقطۂ نظر طے پایا کہ زمانۂ قدیم میں شیعہ حکومت کے زمانے میں
گلبرگہ شریف پر شیعین کسی شیعہ صوبہ دار کے ایما سے یہ الحاق و تصرف عمل میں آیا تھا، اور فحش و مکروہ بیانات شامل کیے گئے تھے یہ حرکت
کسی شیعہ کی ہو یا کسی سنی کی مگر حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی ذات گرامی اس لغو بیانی سے مبرا ہے۔ (اخلاق)

ہی اس کا سبب ہو، تاریخ فرشتہ نہایت متداول تاریخی کتاب ہے، مگر غلطیوں سے مبرا نہیں
طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی برنی بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، مگر آج تک کسی دانشور نے غلط تاریخی
اندراج کو صحیح و معتبر قرار دے کر محور نہیں بنایا ہے، یہ انسانی لغزش ہے۔ اسے نظر انداز کرنا ہی ہوتا ہے،

اسرار الاولیا کی پہلی فصل کے آغاز میں ایک تاریخی اندراج ہے جو غلط ہے، بلکہ محرف ہے اس کے
علاوہ اس میں اور کہیں کوئی تاریخی اندراج نہیں ہے، اور وہ غلط اندراج یہ ہے،

دوشنبہ ہژدہم شعبان سنہ ۶۳۱ سنہ احدیٰ و ثلثین و ستة مائة (اسرار الاولیا، ص ۳)

یعنی پیر کا دن۔ شب برات کے مہینے کی اٹھارہویں تاریخ سنہ ۶۳۱ ہجری۔ اس تاریخی
اندراج کو تقویم کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہیے۔ کہ صحیح ہے یا نہیں اگر صحیح ہے تو فہو المراد ہے اور اگر غلط ہے
تو داخلی شواہد سے کام لے کر صحیح تاریخی اندراج کے استقرار کی کوشش کرنی چاہیے۔

تقویم بتاتی ہے کہ ۱۸ شعبان سنہ ۶۳۱ھ کو دوشنبہ نہیں جمعہ ہے، تقویم میں ایک دن کا فرق
تو ہو سکتا ہے، مگر بالعموم اس سے زیادہ نہیں ہوتا، تقویم کے اعتبار سے ۲۹ کو چاند نظر آتا تھا، مگر
کہیں مطلع صاف تھا اور کہیں نہ تھا، لہٰذا کہیں چاند نظر آیا اور کہیں نظر نہیں آیا، جہاں نظر آ گیا
وہاں تقویم سے مطابقت برقرار رہی اور جہاں نظر نہیں آیا، وہاں ایک دن کا فرق پڑ گیا ان ہی
وجوہ کی بنا پر دو مختلف مقامات پر بعض اوقات دو مختلف دنوں میں عید الفطر منائی جاتی رہی ہے،

اگر اس میں دن تاریخ اور مہینے کو صحیح مان لیا جائے جو صحیح بھی ہے تو داخلی شواہد بتاتے ہیں کہ سنہ ۶۳۱ھ
غلط ہے، سنہ ۶۵۱ھ ہونا چاہیے، جو کاتب و ناقل کے سہو کی بنا پر یا تحریفی کارستانی کی بدولت غلط کر دیا
گیا ہے یہ بھی ہے کہ اسرار الاولیا کے مطبوعہ نسخے میں نقل و کتابت کی بکثرت غلطیاں ہیں، جن کی نشاندہی
بآسانی کی جا سکتی ہے، حیرت ہے کہ مطبع نولکشور کانپور سے نسخۂ اسرار الاولیا اس قدر غلط کیسے شائع ہو گیا

داخلی شواہد | داخلی شواہد سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت مخفی نہیں رہتی کہ اسرار الاولیا کی تدوین (...)

تعلق کس عہد سے ہے، وانہی شواہد میں سے بعض شواہد یہ ہیں:-

(۱) امیر خورد کرمانیؒ کا بیان ہے، دیگر تذکرہ نویس بھی اس سے متفق ہیں کہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ جب دلی سے بخارا کے لیے روانہ ہوئے اور اجودھن (پاکپتن) پہنچے، تو انھوں نے حضرت بابا صاحب کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل کی تھی۔ (سیر الاولیار ص ۱۰۰ اچ)

(۲) حضرت بابا صاحبؒ آخری چوتھائی مدتِ حیات میں اجودھن (پاکپتن) میں سکونت پذیر تھے، قیام اجودھن (پاکپتن) کی مدت امیر خورد کرمانیؒ نے اٹھارہ یا چوبیس سال بتائی ہے (سیر الاولیار ص ۶۳ ج) گویا کہ یقینی طور پر وہ بھی بتا نہیں سکے ہیں، علی بن محمود جاندار شاہ نے ستائیس سال بتائی ہے (دور نظامی ص ۱۲۸ ترجمہ) اس اعتبار سے اجودھن (پاکپتن) میں قیام کا آغاز ۶۵۲ھ یا ۶۴۶ھ یا ۶۴۳ھ سے ہوتا ہے، لہذا جو مجموعۂ ملفوظات حضرت بابا کی خدمت میں رہتے ہوئے اور دوران قیام اجودھن (پاکپتن) میں مرتب ہوتا ہے، وہ ۶۴۳ھ سے پہلے ہرگز مرتب نہیں ہو سکتا، سبب کچھ بھی ہو، مگر یہ تاریخی اندراج قطعاً غلط ہے، اور تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے ہرگز اسے محور نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

(۳) ۶۳۳ھ میں حضرت بابا صاحبؒ کا قیام بالاتفاق ہانسی میں تھا (سیر الاولیار ص ۹۴ ج) قرین قیاس یہ ہے کہ ۶۳۱ھ میں بھی ہانسی ہی میں ہوگا۔ لیکن اگر ہانسی میں قیام نہ ہو تو نہ سہی تاہم اجودھن (پاکپتن) میں قیام ہرگز نہ تھا، واقعات شاہد ہیں کہ حضرت بابا صاحبؒ نے ۶۳۳ھ سے کہیں بعد اجودھن (پاکپتن) میں سکونت اختیار کی تھی، لہذا جو مجموعۂ ملفوظات اجودھن (پاکپتن) میں مرتب ہوا ہے وہ ۶۳۱ھ میں مرتب نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کے کہیں بعد ہوا ہے اور اسرار الاولیاء میں مندرج ۶۳۱ھ محرف اور قطعاً غلط ہے،

(۴) جب خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اسرار الاولیار کا جائزہ لیا جاتا ہے، اور مطالعہ

کیا جاتا ہے، تو زیادہ نہیں تو دو نکتے ایسے ضرور ملتے ہیں، جن کی مدد سے اسرار الاولیار کے عہد تدوین کا تعین بآسانی کیا جا سکتا ہے،

(ا) اسرار الاولیار کی آخری اور بائیسویں فصل کے اختتام پر یہ عبارت ملتی ہے۔

پس این بود کہ از اسرار انوار و الفاظ درر بار شیخ الاسلام در مدت دوازدہ سال شنیدہ است۔ دریں مجموعہ نوشتہ آمد (اسرار الاولیا ص ۹۴)

گویا کہ یہ مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیار بارہ سالہ شغف و انہماک کا ثمرہ ہے جو مرتب کرنے والے کے فطری ذوق و شوق کا آئینہ دار ہے،

(ب) اسرار الاولیار کے مطالعہ سے یہ واضح ہے کہ پندرہویں فصل سے آخر تک آٹھ فصلوں کے شرکا میں حضرت محبوب الٰہیؒ بھی ہیں جس سے یہ ثابت ہے کہ اس بارہ سالہ مدت میں وہ زمانہ بھی شامل ہے کہ جب حضرت محبوب الٰہیؒ اجودھن (پاکپتن) میں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں تھے، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی خود نوشت یادداشت سے نقل کیا ہے کہ رمضان المبارک ۶۶۹ھ میں حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو خلافت نامہ عنایت فرمایا تھا، (سیر الاولیار ص ۱۱۶ اچ) اور خواجہ امیر حسنی علاء سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی یہ بھی نقل کیا ہے، کہ حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو شوال کی کسی تاریخ کو اجودھن (پاکپتن) سے دہلی بھیج دیا تھا، اور محرم کی پانچویں کو حضرت بابا صاحبؒ واصل بحق ہوئے تھے، (فوائد الفواد ص ۵۲) لہذا اگر ۶۶۹ھ کو بارہواں سال مان لیا جائے جو قرین قیاس بلکہ صحیح ہے تو اسرار الاولیار کی تدوین کا آغاز ۶۵۷ھ قرار پاتا ہے جو تقویم کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، بلکہ ہر اعتبار سے صحیح ہے، اور واقعات کے مطابق بھی ہے،

(۵) تقویم یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک دن کا فرق ہے، جو ہو سکتا ہے، تقویم میں ۱۰ شعبان

سنہ ۶۵۷ھ کو یکشنبہ (اتوار) ہے، اور جمادی الآخر کا مہینہ ۲۹ دن کا ہے، غالباً ۲۹ کو اجودھن (پاکپتن)

میں مطلع صاف نہ تھا، اس لیے جمادی الآخر کو، ۳۰ دن کا مہینہ مان لیا ہے، جیسا کہ ہوتا رہتا ہے،

اس اعتبار سے ۱۰ شعبان سنہ ۶۵۷ھ کو دوشنبہ ہی ہے، اور یہی آغاز اسرار الاولیار کی صحیح تاریخ ہے،

قلمی کتابوں میں جو غلطیاں ملتی ہیں انھیں اسی طرح سلجھانا ہوتا ہے، نقاد ہو یا محقق تاوقتے

کہ اس کی کارگزاری میں اخلاق و خون جگر کی چاشنی نہ ہوگی، اس کی کارکردگی کی مقبولیت حاصل

نہیں کرے گی، بہرحال ہیں کامل احتیاط سے حق تنقید ادا کرنا چاہیئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسرار الاولیار کی پہلی فصل کے آغاز میں جو تاریخی اندراج ہے اس کی

وجوہ کچھ بھی ہوں، مگر وہ غلط ہے، اس لیے پہلے اس کی صحت کی جانب متوجہ ہونا ہوگا، جب

صحیح حل مل جائے تو قدم آگے بڑھانا ہوگا، ورنہ غلط اندراج کو کسی حالت میں بھی اپنایا نہیں

جا سکتا، لہذا تقویم کی مطابقت سے اور داخلی شواہد سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اسے صحیح تسلیم

کرنا ہوگا، یہ بھی مناسب ہے کہ قدیم قلمی نسخوں کے مطالعہ سے بھی استفادہ کیا جائے۔

۴۔ اسرار الاولیار کا عہد تدوین تقویم کی مطابقت سے اور داخلی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ اسرار الاولیار

کا عہد تدوین سنہ ۶۵۷ھ تا ۶۶۹ھ ہے اور یہ صحیح ہے، اس عہد تدوین کے اعتبار سے حضرت باباصاحبؒ

کی مجالس میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی اور بعض مجالس میں مولانا برہان الدین ہانسویؒ کی شرکت

بھی صحیح قرار پاتی ہے اور شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی وفات کا ذکر بھی برمحل رہتا ہے، ان کے

علاوہ دیگر تاریخی واقعات بھی برمحل قرار پاتے ہیں، اور وہ خلفشار رفع ہو جاتا ہے، جو غلط تاریخی اندراج

کی بنا پر لاحق ہوتا ہے، لہذا عہد تدوین سنہ ۶۵۷ھ تا سنہ ۶۶۲ھ کو صحیح تسلیم کر کے اسرار الاولیار

کا جائزہ لینا چاہیئے، یقین ہے کہ پھر کوئی الجھن درپیش نہ ہوگی۔

(۵) امتیازی خصوصیات اسرار الاولیار میں بعض امتیازی خصوصیات ہیں جو اس سے پہلے کے ملفوظات

کے مجموعوں میں یا تو ہیں نہیں یا اگر ہیں، تو شاذ و نادر ہی ہیں، اس اعتبار سے اسرار الاولیار امتیازی

و منفرد حیثیت کی مالک ہے ان میں سے بعض کا ذکر خیر زیر قلم آتا ہے،

۱۔ استفسار و مکالمہ مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی پہلی حاضری کا واقعہ شاہد ہے کہ حضرت باباصاحبؒ

کی مبارک نظر طالبوں اور حاضر خدمت ہونے والوں کے قلوب پر بھی رہتی تھی، جو بھی سوال

ان کے دل میں پیدا ہوتا، وہ بصیرت باطنی سے اسے معلوم کر لیتے اور تقریر ہی میں اسے حل

فرما دیتے تھے[1]، عموماً کسی کو دریافت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی، اگر کیفیات سے مغلوب

ہو کر کسی کی زبان پر کچھ آگیا ہے تو وہ مستثنیات میں سے ہے، ایسی مثالیں اسرار الاولیار میں خال

خال مل جاتی ہیں، اس کو مکالمہ سے تعبیر کر لیا جائے یا استفسار سے، دراصل ذہن مغلوبیت کا تاثر،

ورنہ دوران تقریر میں مداخلت و استفسار خوبی نہیں بلکہ معیوب ہے، جو بے ادبی کے مصداق

بھی ہو سکتا ہے، بہرحال ایسی مثالیں متقدمین کی کتب ملفوظات کے بالمقابل امتیازی نوعیت

کی مالک ہیں جس کی اتباع کے نقوش فوائد الفواد وغیرہ بعد کی کتب ملفوظات میں ملتے ہیں گویا کہ

اسرار الاولیار نقش اول ہے، اور فوائد الفواد نقش ثانی ہے، اور وہ مثالیں یہ ہیں،

(۱) ہمیں کہ شیخ الاسلام این بیت بہ زبان راند عزیزے از اہل صفہ . . . . .

روئے بہ زمیں آورد و عرض داشت کرد۔ الخ (اسرار الاولیار فصل سوم ص ۱۶)

(ب) آں گاہ عزیزے از اہل صفہ حاضر بود۔ روے بہ زمین آورد و عرض کرد

و گفت۔ الخ۔ (ایضاً ص ۱۷)

(ج) در آں میان عزیزے حاضر بود و عرض داشت کرد۔ الخ (اسرار الاولیار فصل ۱۴ ص ۶۲)

ان مثالوں سے یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیار میں استفسار و مکالمہ ہے، مگر بقدر قلیل ہے

---

[1] اسرار الاولیار ص ۱۰۱ ج

تاہم اس سے اسرار الاولیاء کی اہمیت اور اس کی امتیازی نوعیت واضح ہے۔

۷۔ فصول | اسرار الاولیاء کئی فصلوں پر منقسم ہے، ہر فصل کسی عنوان سے متعلق ہے، جو ہر فصل کے آغاز میں تحریر ہے، عنوان سے متعلق معلومات اس فصل میں فراہم کی ہیں، خواہ ان معلومات کا تعلق مختلف بیانات ہی سے کیوں نہ ہو، تاہم اس سے یہ سہولت ہے، کہ کسی ایک بات کو پوری کتاب میں تلاش کرنے کی زحمت سے دوچار نہیں ہونا پڑتا بلکہ کسی ایک عنوان کے تحت تلاش کر لینا کافی ہوتا ہے، تلاش میں نہ تو وقت ضائع ہوتا ہے اور نہ تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے، بلاشبہ یہ خوبی لائق تحسین ہے، جو اس سے پیشتر کی کتب ملفوظات میں نہیں ہے، علی بن محمود جاندار شاہؒ نے درر نظامی میں اسرار الاولیاء ہی کی اتباع کی ہے اس لئے اسرار الاولیاء نقش اول ہے اور درر نظامی نقش ثانی ہے، مگر فوائد الفواد اور خیر المجالس میں یہ خوبی نایاب ہے،

بعض فصلوں کے آغاز میں بعض ممتاز ترین شرکا کے اسمائے گرامی مندرج ہیں جن سے مجالس کی نوعیت و اہمیت واضح ہے آخر میں اختتام کی نوعیت بھی واضح کی ہے، درر نظامی میں ان دونوں اوصاف کا فقدان ہے،

۸۔ عربی فارسی ہندی مرکبات | اسرار الاولیاء میں کئی مقامات ایسے ہیں جن سے ہندی فارسی اور ہندی عربی مرکبات کے استعمال و رواج کا پتہ چلتا ہے اور لسانی اتحاد کی نشاندہی ہوتی ہے، گویا کہ یہ تخم ریزی ہے اردو زبان کے لیے جو پھلی پھولی اور پروان چڑھی، جو آج گوناگوں موانعات کے باوجود دنیا کی شائستہ ترین زبان ہے۔ بعض مثالیں یہ ہیں:۔

(ا) اور ابھیا غریب گفتندے۔ اسرار الاولیاء فصل پہلی ص ۴

(ب) فرید بجو دھنی ،، دوسری ص ۱۴

(ج) اور اور دیش بدھنی گفتندے۔ ،، تیرھویں ص ۰

(د) خریزۂ ہندی ،، ،، ص ۷۱

اس روش کی اتباع صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ نے کی ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء نقش اول اور سیر الاولیاء نقش ثانی ہے، خیر المجالس میں اس اتباع کے گہرے نقوش ملتے ہیں

۹۔ تبلیغی کارنامہ | اسرار الاولیاء کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک تبلیغی کارنامہ کا ذکر ہے، جو راحت المحبین میں بھی ہے، مگر فوائد الفواد اور خیر المجالس جیسی بعد کی کتب ملفوظات میں نہیں ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء اولین اور منفرد اوصاف کی مالک ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ خواجہ قطب الدین چشتیؒ جن سے مراد خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ ہیں، انکی مجلس میں حاضرین مجلس میں سے کسی نے دریافت کیا کہ کوئی کیسے جانے کہ وہ کامل ہو گیا ہے اور اس نے سلوک کی منازل طے کر لی ہیں، آپ نے فرمایا کہ یہ شخص کسی مردے پر دم کرے، اگر وہ بحکم الٰہی زندہ ہو جائے[1]، تو یہ علامت اس کی کمالیت کی ہے۔ ص

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

ابھی یہ گفتگو ختم ہونے نہ پائی تھی کہ ایک بڑھیا روتی دھوتی حضرت خواجہ قطب الدین چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرا ایک ہی لڑکا تھا بادشاہ نے بے گناہ اسے سولی پر چڑھا دیا ہے، آپ یہ سنتے ہی عصا ہاتھ میں لیکر اسکے ہمراہ ہو لئے موقع واردات پر پہنچے لڑکے کو سولی پر چڑھایا جا چکا تھا آثار زندگی باقی نہ تھے آپنے دیکھا اور بارگاہ الٰہی میں التجا کی خداوندا! اگر بادشاہ نے اسے بے جرم و خطا سولی پر چڑھوایا ہے تو آپ اسے زندہ فرما دیں آپنے یہ فرمایا ہی تھا کہ دم لڑکا زندہ ہو گیا، مولانا روم نے فرمایا ہے

اولیا راہست قدرت از الٰہ تیر جستہ باز گردانند ز راہ

اس عمل کرامت کی برکت سے ہزاروں غیر مسلم جنکا تعلق کسی طرح ہندوستان سے تھا مسلمان ہو گئے، اور صحیح راہ عمل اختیار کر لی تھی، لکھا ہے۔

آں روز چند ہزار و در ہزار ہندو مسلمان شدند، (اسرار الاولیاء ص ۸۹)

ہندو سے مراد بدھسٹ بھی ہو سکتے ہیں، جو چشت خراسان اور بت بامیان کے علاوہ بھی آباد تھے اور وہ ہندو بھی جو عہد غزنوی سے غزنی اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے اور کھلم کھلا اپنے ٹھاکروں کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے اگرچہ تعداد میں بہت تھوڑے (باقی)

---

[1] امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ تصور عوام در نفس ایشان موثر آید۔ اولیاء را آں تصور نفس غیر موثر آید ... الخ صاحب کرامتے تصور کند در نفس غیرے اثر آں تصور حاصل می شود تا اگر موت شخصے تصور کند آں شخص بمیرد۔ و اگر دیدن شخصے تصور کند در حال آں شخص حاضر شود (سیر الاولیاء ص ۳۵۲، ج)

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کا مکتوب گرامی

اڈیٹر معارف کے نام

ندوۃ المصنفین دہلی۔ ۱۰/اکتوبر ۱۹۸۰ء

مجی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ'

بہت دنوں سے یہ عریضہ تحریر کرنے کے ارادے میں تھا، یوں ہی، آج، کل ہوتی رہی، ستمبر کا بڑا حصہ کلکتہ میں گذرا، وہیں سے مبارکباد تحریر کرنے کا خیال تھا، مگر نگاہ زیادہ موٹی ہوگئی ہے، ضروری خطوط بھی یوں ہی رہجاتے ہیں، اب عام طور پر کسی دوسرے ہی سے خط لکھتا ہوں، حکومت نے جو علمی اعزاز آپ کو عطا کیا ہے، ہم سب کے لیے باعث اعزاز اور وجہ مسرت ہے، مبارکباد رسمی نہیں، قلبی قبول فرمائیے، آپ نے گزشتہ چالیس سال میں جو علمی، تاریخی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں، یہ ایوارڈ ان کا ادنیٰ صلہ ہے، آپ ہر حیثیت سے اس اعزاز و اکرام کے مستحق تھے، حضرت سید صاحب مرحوم اور شاہ صاحب مرحوم کی روحیں یہ خبر سن کر عالم ارواح میں روحوں کے اجتماع کو پُرمسرت خطاب کر رہی ہوں گی، یہ واقعہ ہے کہ اب آپ ہی ان ارواح پاک کے جانشین ہیں، حق بحق دار رسید ایک عام مثل ہے، لیکن یہ مثل آپ پر اپنی تمام خصوصیتوں اور تمام رعنائیوں کے ساتھ صادق آتی ہے، یہ ایوارڈ مجھے بھی مل چکا ہے مگر میرا اسوقت بھی اور اب بھی یہ پختہ خیال ہے کہ یہ علمی اعزاز آپ کو ہم لوگوں سے پہلے ملنا چاہیئے تھا، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں اور خود بھی دعا کا محتاج ہوں، نقرس کی تکلیف تو سالہا سال سے ہے، ایک سال سے عرق النسا کے عارضے نے بھی گھیر رکھا ہے، ضعف و اضمحلال اور حالات کی تلخیوں کے باوجود گاڑی چل رہی ہے، کیا بعید ہے آپ سے ۳۰/اکتوبر کو ندوۃ العلماء میں ملاقات ہو جائے، خط کی ناہمواری کے لیے معذرت ہے،

عتیق الرحمٰن عثمانی

وفیات

ظفر احمد صدیقی مرحوم

از۔ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، لکھنؤ،

۴/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو جناب ظفر احمد صدیقی وکیل، سکریٹری دینی تعلیمی کونسل کا انتقال اپنے آبائی وطن راما بھاری تحصیل بسواں ضلع سیتاپور میں، ۷½ بجے صبح کو طویل علالت کے بعد ہوگیا، دفتر دینی تعلیمی کونسل لکھنؤ میں وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ایما پر ۱۹۵۵ء سے مقیم تھے، یہ ایک طرح سے ان کا وطن ثانی بن گیا تھا، اپنی وفات سے ۴۸ گھنٹے پہلے اس حال میں رخصت ہوئے تھے کہ انھیں ہوش نہیں تھا، بلڈپوریا کی وجہ سے ایک ہفتہ سے غفلت تھی، احباب اور رفقا نے اُسی وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ برسوں کا یہ تھکا ہوا مسافر اور ساتھی اب لکھنؤ واپس نہیں آئے گا، سیتاپور سے فون پر اطلاع ملی، وہ سب سے جدا ہو کر اللہ کو پیارے ہوگئے، ان کی اہلیہ کا انتقال سال بھر پہلے ہو چکا تھا، اولاد کوئی نہیں تھی، بھتیجوں کو اولاد سمجھتے رہے، جن کو اپنی نگرانی میں تعلیم دلائی، اُن کے حقیقی بھائی کا قیام راما بھاری میں ہے، جہاں اُن کا خاندان صدیوں سے آباد ہے،

ظفر صاحب نے تعلیم مسلم یونیورسٹی میں پائی، ان کا قیام میکڈانلڈ ہوسٹل میں تھا، تعلیم کے بعد سیتاپور میں وکالت شروع کی، ان کا شمار وہاں کے کامیاب وکیلوں میں تھا، ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلم لیگ سے وابستہ رہے، تبلیغی کاموں سے بھی شغف رکھا، لیکن جب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم

نے ۱۹۵۹ء میں بستی میں بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں کنونشن کیا اور وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ اس سلسلہ میں مستقل کام کی ضرورت ہے، تو حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ایما پر ظفر صاحب نے اپنی کامیاب وکالت چھوڑ دی اور دینی تعلیمی کونسل کے کاموں کے لیے اپنے کو وقف کر دیا، پھر ان کو ایسی لگن پیدا ہوئی کہ اپنے کھانے پینے کی فکر زیادہ نہ کرتے، خود ہی اسٹوو پر کوئی چیز تیار کر لیتے اور روٹی بازار سے منگا لیتے، اسی کو کھا کر اکتفا کر لیتے، صبح کی چائے بھی خود ہی تیار کر لیتے اور اپنے مہمانوں کی بھی اس سے ضیافت کرتے مگر اپنی ان دشواریوں کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا، اس طرح انھوں نے ۱۷ سال جس بے نفسی، جاں فشانی، فرض شناسی اور دل سوزی سے وقت گزارا اس کی مثال ملنی مشکل ہے، جناب شفیق الرحمن ایڈوکیٹ نے ان کو پیش کش کی کہ اگر وہ لکھنؤ میں کمشنری کے مقدمات لے لیا کریں تو معقول آمدنی ہو جایا کرے گی، انھوں نے معذرت کی کہ جو چیز چھوڑ دی اس کو پھر اختیار کرنا صحیح نہیں، کونسل میں بڑھتی ہوئی گرانی کی وجہ سے ان کے الاونس میں اضافہ کا مسئلہ آیا تو انھوں نے اپنے جذبۂ ایثار سے اضافہ منظور نہیں کیا،

وہ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے، عشا کے بعد فوراً سو جاتے، تہجد کے سختی سے پابند رہے، سفر ہو یا قیام، بیماری ہو یا صحت، جلسے ہوں یا کنونشن ہر حال میں اس کی پابندی کرتے، ذکر سے بھی شغل رکھتے، صبح کو ہلکے سے ناشتہ کے ساتھ چائے پی کر اخبار پڑھتے، تعلیمی سلسلہ کی کوئی بات اخبار میں پڑھ لیتے تو اسی وقت قلم برداشتہ ایک مضمون لکھ ڈالتے، ان کا خط اچھا نہیں تھا، اکثر کہتے کہ میں خود اپنا لکھا مشکل سے پڑھ پاتا ہوں، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے، عبارت آرائی بالکل نہیں کرتے لیکن ٹھوس حقائق سے مسئلہ کو واضح کرتے، دینی تعلیمی کونسل اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق اہم لٹریچر ان ہی کا تیار کیا ہوا ہے، ۱۹۶۵ء کے بعد علی گڑھ کے جتنے معاملات اٹھے ان کا وہ گہرا مطالعہ کرتے رہے، مرتے دم تک وہ اس محاذ پر

بڑی مردانگی اور پامردی سے جمے رہے، حکومت نے مسلم یونیورسٹی سے متعلق جو بھی قانون بنایا، اس کی موشگافیوں میں انھوں نے ہندوستان کے چوٹی کے ماہرین قانون سے ٹکر لی اور کبھی کسی موقع پر آنکھ نہیں جھپکائی، علی گڑھ سے متعلق کوئی چیز ان کے مشوروں کے بغیر مرتب نہیں ہوتی تھی، سب کو ان پر مکمل اعتماد تھا، مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے وہ جس طرح سینہ سپر رہے، وہ اس یونیورسٹی کی نئی نسل کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ ہے، انھوں نے اس کے لیے برابر جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کیا، اس سے متعلق حکومت کی پر پیچ حکمت عملی کو واشگاف کرنے میں ان کو بڑی مہارت تھی، ان ہی کی تحریروں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کو اس کے اصلی اور حقیقی پس منظر میں سمجھتے رہے،

وہ دار العلوم ندوہ کے بھی قانونی مشیر تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت، مسلم مجلس، دینی تعلیمی کونسل، مسلم مائنارٹیز ایسوسی ایشن، ہر جگہ ان کی قانونی مہارت سے فائدہ اٹھایا جاتا، شفیق الرحمن صاحب ایڈوکیٹ کنوینر مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی نے ان کی ان صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کا نام مجلس شوریٰ کا صدر رکھ دیا تھا، وہ خود کم بولتے مگر بولتے تو حقائق ہی بولتے، نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کرتے، عمر میں ان سے کوئی چھوٹا بھی اگر معقول رائے دیتا تو اسے فوراً قبول کر لیتے، وکیل تھے لیکن زیادہ بحث پسند نہیں کرتے، مقرر تو نہیں تھے لیکن اپنی تقریروں میں جچے تلے الفاظ میں اپنی باتیں پیش کر دیتے، شعر و شاعری کا ذوق نہیں تھا لیکن اچھے شعر کا لطف لیتے اور برمحل شعر بھی پڑھ جاتے، چہرہ پر شب بیداری کی رونق اور سرخی دکھائی دیتی، ہونٹوں پر پان کی سرخی جمی رہتی، دعوتوں میں ان کے بے تکلف دوست ان کو میٹھا کم کھانے پر اصرار کرتے لیکن وہ انکار کرتے، مگر دوستوں کے اصرار پر لطف و لذت سے کھانے پر آمادہ ہو جاتے، ان کو آم اور جامن بھی بہت پسند تھے، وہ غلہ گھری سے منگاتے، ایک مرتبہ ان کا دلیا چارپائی پر دھوپ میں

سوکھ رہا تھا گائے اگر کھا گئی، انھوں نے اپنی معصومیت میں اس کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا تو مستقل موضوع بنا رہا، سفر میں شفیق الرحمن صاحب کا ان کا ساتھ ہوتا تو جونیر ہونے کے ناطے سارے فرائض ان ہی کو انجام دینے پڑتے، چائے، پان، حقہ اور اخبار وغیرہ کی فراہمی کا انتظام ان کے ذمہ ہوتا، شفیق الرحمن صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری رہتی، مگر یہ دو پیاروں کی باتیں ہوتیں، دونوں میں بیحد محبت تھی، دونوں صبح وشام ملتے، شفیق الرحمن صاحب ان کا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے کہ اپنی قیمتی رائے گھورے پر ڈال دیتے ہو، ظفر صاحب ہنس کر جو جواب دیتے اس میں اخلاص اور محبت کے آبدار موتی چمکتے ہوئے نظر آتے، یہ پُر کیف اور بے تکلف مجلسیں اب اشکبار آنکھوں کے ساتھ یاد آئیں گی، ظفر صاحب نے شفیق الرحمن صاحب کو تھرڈ کلاس میں یہ کہہ کر سفر کرانا شروع کیا کہ ملت کا کام کرنا ہے تو تھرڈ کلاس میں سفر کرنا پڑے گا اور مسجد کی چٹائی پر لیٹنا ہوگا، میں ان کو مجسم تقویٰ کہتا، جب کبھی اُن کے ساتھ سفر کیا تو ان کی کفایت شعاری کا سارا منظر دیکھنے میں آتا، سفر کے بعد فوراً حساب پیش کر دیتے، کنجی ان کے ازار بند میں بندھی ہوتی، سفر میں ان کا جھولا ساتھ ہوتا تھا، جس میں ماہرین قانون کی رائے، قانون کی کتابیں، ڈبیا، بٹوہ، اور ضرورت کا سارا سامان ہوتا، چند منٹ کے نوٹس پر وہ سفر پر روانہ ہو سکتے تھے، دو مرتبہ پہلے بھی فالج کا اثر ہو چکا تھا، علاج سے ٹھیک ہو گئے تھے، میں نے سفر سے منع کر رکھا تھا، لیکن مسلم یونیورسٹی کے مسئلے میں بیتاب ہو کر اچانک دہلی کا سفر کیا، پھر جو پڑے تو سنبھلے تو ضرور لیکن بائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں پر مستقل اثر رہا، اور رفتہ رفتہ معذور ہو گئے، ذہن آخر تک کام کرتا رہا لیکن صحت گرتی رہی،

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں ان کی خدمات گنانے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے اقلیتی کردار کی اصطلاح ان ہی کی ایجاد ہے، جسے پورے ملک نے قبول کر لیا، طلبہ انھیں ظفر چچا کہتے، ان کی باتیں تسلیم کرنے میں تامل نہ کرتے، ایک بار مسلم یونیورسٹی میں ایک اسٹرائیک ہوئی اخبار میں

خبر پڑھتے ہی ہم دونوں وہاں پہونچے، طلبہ نے ہماری مداخلت سے اسٹرائیک ختم کر دی، ظفر صاحب نے یونین میں جو تقریر کی اس سے طلبہ بالکل مطمئن تھے، مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں شروع سے ہم لوگوں کی یہ کوشش رہی کہ تحریک علی گڑھ شہر اور مسلم یونیورسٹی کیمپس کے اندر نہ رہے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں چلائی جائے تاکہ یونیورسٹی کو نقصان نہ پہونچے، بیگ کمیٹی کی مشہور رپورٹ کو مرتب کرنے میں ظفر صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے، مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور تعلیمی جائزہ کے سلسلہ میں انھوں نے متعدد کتابچے، پھر اردو اور انگریزی میں بکثرت مضامین لکھے، وہ جب یاد آئیں گے تو ان کا خلوص، ان کا بے پایاں ایثار، ان کی بے نفسی، ملت کے لئے ان کی تڑپ اور دردمندی آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آئیگی، وہ اپنے پیچھے بے لوث اور بے غرض خدمات کی ایک مثال چھوڑ گئے ہیں، جو کم از کم مسلم یونیورسٹی کی نئی نسل کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے، جناب عدیل عباسی کے فوراً بعد ان کا انتقال پوری ملت کا بہت بڑا سانحہ ہے، لیکن جن مضبوط بنیادوں پر انھوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے، امید ہے کہ وہ قائم رہے گی، نیا خون ملتا رہے گا، اور یہ کام برابر برگ و بار لاتا رہے گا، ظفر صاحب نے اپنی مخلصانہ خدمات کی جو مثال چھوڑی ہے، اللہ تعالے مسلم یونیورسٹی اور دینی تعلیمی کونسل کے خدمت گزاروں میں اس جذبہ کو دوام عطا کرے، اور ان کو آخرت میں اس کا بہترین اجر دے۔ آمین ثم آمین،

معارف:- جناب ظفر احمد صدیقی صاحب آج کل کی اصطلاح کے لحاظ سے تو بہت بڑے آدمی نہیں ہو سکے لیکن ان میں جو بے نفسی، بے غرضی اور ایثار پسندی تھی، اس لحاظ سے ان کی شخصیت میں بڑے پن کے پورے اوصاف تھے، مسلم یونیورسٹی کا ایسا جانثار مرد مجاہد مشکل سے کوئی ملے گا، جس لگن اور ایثار کے ساتھ انھوں نے اس یونیورسٹی کی خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے، مگر دکھ کی بات ہے کہ اس یونیورسٹی کے لوگوں نے ان کی وہ قدر نہیں کی

جسکے وہ واقعی مستحق تھے، ان کی علالت کے زمانہ میں راقم کو جناب محترم نواب عبید الرحمن خاں شیروانی کی معیت میں ان کی عیادت کرنے کا کئی بار اتفاق ہوا، دینی تعلیمی کونسل کے دفتر کے ایک معمولی کمرہ میں ان کو جس طرح پایا اس کو دیکھ کر انتہائی تکلیف ہوئی، بجلی کا ایک بہت ہی معمولی پنکھا ان کے سامنے ہوتا، ان کی راحت کا سامان اس سے بھی زیادہ معمولی تھا، خیال آیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اس مرد مجاہد کے لیے وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنی ہر چیز ان پر نچھاور کر دینا چاہئے تھی مگر یہ لوگ لکھنؤ آتے تو شاید ان کی عیادت کی بھی تکلیف گوارا نہ کرتے، اس کا بھی احساس ہے کہ اگر علی گڑھ کے لوگ ان کی مالی امداد کرنا بھی چاہتے تو وہ اپنی خودداری اور عزت نفس میں اس کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے، مگر علی گڑھ کے طلبہ و اساتذہ اپنے نفس کا محاسبہ کریں کہ اپنے اس جان نثار مجاہد کے لیے ان کو کیا کرنا چاہئے تھا، اور کیا نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد ان کی خدمات کا صلہ شاید یہی ملا ہوگا کہ وہاں کے ڈرائنگ روموں کے صوفوں پر اور دوسری تفریحی باتوں کے سلسلہ میں چند لمحوں کے لیے ان کا بھی ذکر آگیا ہوگا، اس سے ہم کو اپنی ملت کی نفسیات کا اندازہ کرنا چاہئے، ہم میں آج کل اچھی قیادت نہیں ابھر رہی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مخلص کارکنوں اور رہنماؤں کی وہ قدر نہیں کرتے جس کے وہ واقعی مستحق ہوتے ہیں۔

سیرۃ جلد ہفتم

سیرۃ کی چھ جلدیں مکمل کرنے کے بعد سید صاحب علیہ الرحمۃ نے سیرۃ جلد ہفتم مشتمل بر معاملات بھی لکھنا شروع کر دی تھی، ابھی اس سے متعلق چند مضامین اور مباحث ہی حوالۂ قلم کئے گئے تھے، کہ آپ انتقال فرما گئے، اور یہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی اپنے استاد مرحوم کی طرح وہ بھی اسکی حسرت اپنے ساتھ لے گئے، یہ ان ہی چند مضامین اور مباحث کا مجموعہ ہے، قیمت: ۱۲-۰۰ از مولانا سید سلیمان ندوی

بَابُ التَّقرِیظِ وَالانتِقَاد

نئے رسالے

جرنل خدا بخش لائبریری: مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب، طباعت اچھی، سائز ۲۲×۱۰ صفحات مقرر نہیں، قیمت سالانہ پندرہ روپیے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔

یہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کا سہ ماہی جرنل ہے، ابتک اس کے آٹھ شمارے شائع ہوئے ہیں، اس میں لائبریری ہی سے متعلق مضامین چھپتے ہیں، اس کی مجلس ادارت قاضی عبدالودود (صدر) ڈاکٹر سید حسن عسکری (رکن)، افسر الدولہ فیاض الدین حیدر (رکن) اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار (ناظم) پر مشتمل ہے، اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی مضامین شائع کئے جاتے ہیں اور مضمون نگاروں کا مختصر تعارف بھی ہوتا ہے، اس کی اکثر اشاعتوں میں وہ توسیعی خطبات بھی شائع کئے جاتے ہیں جو لائبریری کے زیر اہتمام ہر سال دیئے جاتے ہیں، پہلے شمارہ کی ابتدا ڈاکٹر نذیر احمد (مسلم یونیورسٹی) کے توسیعی خطبہ "فارسی اور ہندوستان" سے ہوئی ہے، یہ ایک مبسوط اور عالمانہ خطبہ ہے، اس میں ہندوستانی تہذیب، تمدن اور معاشرت پر فارسی زبان کے اثرات کا ذکر ہے، اسی اشاعت کے انگریزی حصہ میں ڈاکٹر سید حسن عسکری کا ایک فاضلانہ خطبہ بھی درج ہے اس میں سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگ مولانا مظفر شمس بلخی کے مکتوبات کا اس حیثیت سے جائزہ لیا گیا ہے کہ وہ اس عہد کی سماجی و سیاسی تاریخ کا ماخذ ہیں۔ پانچویں، چھٹے اور ساتویں، آٹھویں مشترکہ شمارہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مضامین اور خطبے شامل ہیں، چوتھے شمارہ کی ابتدا میں کلیم الدین احمد صاحب کا توسیعی خطبہ "میری تنقید۔ ایک باز دید"

درج ہے، اس میں انھوں نے خود اپنی تمام تنقیدی کتابوں کا جائزہ لیکر اپنے بعض خیالات کی وضاحت اور مزید توثیق کی ہے اور ان پر اعتراضات کا جواب دیا ہے، ان کا اپنا خیال ہے کہ "زیادہ سے زیادہ قارئین دل و دماغ سے ان کی باتوں کو مان لیتے ہیں لیکن زبان سے نہیں، نہیں کہنا اپنی ادا سمجھتے ہیں"، وہ ایک تمثیل پیش کرکے یہ دعوی کرتے ہیں کہ اردو کے ادبی و تنقیدی ذخیرے کی خامیاں ان پر تو منکشف ہوئیں اور دوسروں سے مخفی رہیں۔

اسی نمبر میں ڈاکٹر ہاشم علی کا انگریزی مضمون "اسلامی تقویم کی تشکیل نو" بھی توسیعی خطبات کی کڑی ہے، کتبخانہ کے بانی خدابخش پر دو انگریزی مضامین شائع ہوئے ہیں، ایک خود ان کے فرزند صلاح الدین خدابخش کا اور دوسرا مشہور مورخ ڈاکٹر جدوناتھ سرکار کا ہے، ایک انگریزی مضمون کتبخانہ خدابخش کے متعلق بھی چھپا ہے، ایک اور انگریزی مضمون بانی کتبخانہ کے قلم سے اسلامی کتبخانے پر پچھلے شمارہ میں دیا گیا ہے، انگریزی کا ایک مضمون عہد سلطنت میں صوفی لٹریچر کا ایک جائزہ بھی اہم ہے، فارسی میں اب تک تقریباً ایک درجن مضامین شائع ہوئے ہیں، جن میں بعض قاضی عبدالودود صاحب کے قلم سے ہیں، ان میں خدابخش لائبریری کے بعض نادر اور اہم مخطوطات کا متن شائع کیا گیا ہے، اور ہر ایک کے شروع میں مخطوطہ اور اس کے مصنف سے متعلق ضروری معلومات تحریر کئے گئے ہیں، عربی میں یہ مضامین شائع ہوئے ہیں، طبقات الحنفیہ و مولفوہا تنزیہ الاعتقاد عن الحلول والاتحاد للسیوطی (ڈاکٹر عبدالرشید پٹنہ یونیورسٹی)، رسالۃ الشعاعات للکندی ڈاکٹر مختار الدین آرزو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اسی نوعیت کا مضمون عہد ہمایونی کی ایک عربی تصنیف "عصمۃ الانبیاء" مولفہ ملا عبداللہ سلطان پوری (ڈاکٹر سید عبدالباری علی گڑھ یونیورسٹی) بھی ہے لیکن یہ اردو میں ہے، دیوان جمیلہ خدابخش (ڈاکٹر حمیرا خاتون) میں خدابخش خان کی اہلیہ کی شاعری کا ذکر ہے، پچھلے شمارہ میں لائبریری کے قیام کے وقت بانی کتب خانہ کی تقریر اسکی سالانہ رپوٹ

اور لائبریری کے متعلق مولانا شبلی کے تاثرات درج ہیں، خدابخش لائبریری میں اردو کے قدیم اور نایاب رسالوں کا مفید ذخیرہ ہے، ان سے متعلق چند مضامین بھی چھپے ہیں، ان میں رسائل کے مقاصد و خصوصیات کے علاوہ ان کے بعض مکمل مضامین بھی نقل کئے گئے ہیں، اور بعض کے خلاصے دئے گئے ہیں، پہلے شمارہ میں کشمیر درپن (اڈیٹر سر تیج بہادر سپرو) کا تعارف ہے، اور اس سے پنڈت موتی لال نہرو کی ایک اہم اور یادگار صدارتی تقریر نقل کی گئی ہے، جو یوپی میں انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی صوبائی کانفرنس میں ہوئی تھی، چوتھے شمارہ میں میر اکبر علی کی ادارت میں ایک برس (جنوری ۱۸۹۶ء سے دسمبر ۱۸۹۶ء) تک شائع ہونے والے رسالہ ادیب (فیروز آباد) کے اہم مشمولات کا خلاصہ اور اس کا تعارف درج ہے، ساتواں اور آٹھواں شمارہ مشترکہ ہے اس کی حیثیت خاص نمبر کی ہے، اور یہ ماہنامہ ادیب (الہ آباد) کے ساڑھے تین برس (جنوری ۱۹۱۰ء تا جولائی ۱۹۱۳ء) کے ۴۳ شماروں کا انتخاب ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ متنوع، مفید اور دلکش مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں اس دور اور اس سے قبل کے کئی اکابر علم و ادب کے متعلق پر مغز مضامین ہیں، ایک مضمون علامہ شبلی اور ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پر بھی ہے، اسی حصہ میں پریم چند کے چھ افسانوں کے ساتھ ان کا ایک مضمون بھی ہے، دوسرے حصہ میں طویل اور مختصر مضامین نیز رسالہ ادیب کے مختلف ادارتی نوٹ درج ہیں، ان میں اکثر اردو زبان کے امور و مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اور اردو کو قومی زبان بنائے جانے کی حمایت اور اس کے رسم الخط تبدیل کئے جانے کی مخالفت کا ذکر ہے، یہ سب تحریریں ادیب کے اڈیٹروں منشی نوبت رائے نظر، پیارے لال شاکر اور دوسرے ہندو اہل قلم کی ہیں، اس حصہ میں ایک بہت مدلل مضمون نشی کانت چٹو پادھیا کا ہے، انھوں نے اردو کا مقابلہ انگریزی اور ملک کی مختلف زبانوں سے کرکے ثابت کیا ہے کہ اردو ہی پورے ملک کی قومی زبان بنائے جانے کے لائق ہے، اردو بیزاری اور اردو کشی کے موجودہ دور میں اب ان حقائق کو

کون باور کرے گا۔ اس نمبر میں کئی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں، جن سے پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں؛ نیز مرزا غالب، عبدالرشید دیلمی عرف آغا رشید، سید علی خاں جواہر رقم استاد اورنگ زیب، آخری شاہ مغلیہ اور خواجہ میر علی تبریزی کی تحریروں کے عکسی نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ اس جرنل کے ہر شمارہ میں لائبریری کے وزیٹرز رجسٹر سے مشاہیر کی اردو یا انگریزی تحریروں کا عکس بھی شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں ہندوستان و پاکستان اور بعض اسلامی ملکوں کے علاوہ یورپ کے فضلا کی تحریروں کا عکس دیا گیا ہے، ہر شمارہ میں تصحیح و اضافہ اور مطبوعات جدیدہ کے مستقل عنوانات بھی ہوتے ہیں؛ اول الذکر میں کتبخانہ کی قدیم فہرستوں کے اغلاط کی تصحیح کی جاتی ہے، اور موخر الذکر میں نئی کتابوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے، یہ دونوں حصے عموماً قاضی عبدالودود کے قلم سے ہوتے ہیں، فرہنگ آصفیہ (مولوی سید احمد دہلوی) پر طویل تبصرہ قاضی صاحب کی وسیع النظری کا ثبوت ہے لیکن اس میں کتابت و طباعت کی غلطیاں بکثرت رہتی ہیں۔ اس لئے اکثر مضامین کے ساتھ صحت نامہ بھی لگا رہتا ہے، پٹنہ کی یہ لائبریری ہندوستان کے لئے ایک بہت ہی قابل فخر اور مایہ ناز چیز ہے، دعا ہے کہ یہ کتب خانہ ہر حال میں مایہ ناز بنا رہے، اور اس کے ذریعہ سے مفید علمی خدمات انجام پاتی رہیں۔

مجلہ تحقیق :- مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، سائز ۲۰ × ۲۶، صفحات ۱۵۰، قیمت سالانہ ۴ روپے فی شمارہ ایک روپیہ۔ پتہ فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

یہ نیا رسالہ بھی سہ ماہی ہے جو پنجاب یونیورسٹی کی فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ کی طرف سے شائع ہوا ہے، ہمارے پیش نظر اس کا پہلا اور دوسرا مشترک شمارہ ہے۔ اس کا خاص مقصد یونیورسٹی اور اس سے متعلق کالجوں کے اساتذہ کی نگارشات کی اشاعت ہے، لیکن یہ دوسرے فضلاء کے مضامین سے یکسر خالی نہیں ہے، پہلا مضمون اسی نوعیت کا ہے جو پاکستان کے مشہور فاضل جناب مشفق خواجہ

کے قلم سے ہے، اس میں شاہ قدرت اللہ قدرت کے نام، خاندان اور ابتدائی تعلیم وغیرہ کے متعلق بہت تحقیق سے معلومات بیان کئے گئے ہیں، اور ان کی ولادت، ان کے ترک وطن اور مرشد آباد میں قیام وغیرہ کے زمانہ کی تعیین بڑی دیدہ ریزی سے کی گئی ہے، آخر میں قدرت کے ذریعۂ معاش، سیرت و کردار، معاصرین، اولاد، شاعرانہ کمالات، کلام اور دیوان کے متعدد قلمی نسخوں کے متعلق محققانہ بحث کی گئی ہے، اور ابتک قدرت کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا جائزہ دقت نظر سے لے کر اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے، ایک اور مضمون میں جہانگیری اور شاہجہانی عہد کے ایک شاعر شیدا فتح پوری کے حالات، شاعری اور دیوان وغیرہ پر سیر حاصل اور پُر مغز بحث ہے، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مکاتیب اقبال کے موجودہ مجموعوں پر اظہار خیال کرکے ان کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان کو ازسرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت واضح کی ہے، اس سلسلہ میں بعض اصول بھی بتائے ہیں، کلام محمود کے نادر لغات و اصطلاحات (ڈاکٹر محمد بشیر حسین) بھی محققانہ مضمون ہے، اس میں اکبری دور کے مولانا محمود لاہوری کے کلام سے تیس نادر الفاظ منتخب کرکے ان کی تشریح و وضاحت کی ہے، ان لفظوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے بعض کا ذکر کسی لغت و فرہنگ میں نہیں اور بعض کا ذکر محض خاص فرہنگوں یا ایک ہی کسی فرہنگ میں ہے، بعض لفظوں کے معانی لغت کی کتابوں میں درج ہیں، لیکن ان کی مثالیں نہیں دی گئی ہیں، لائق مضمون نگار نے اساتذہ کے کلام سے مثالیں اور شواہد پیش کیے ہیں، جن سے فارسی شعر و ادب سے ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک مضمون میں منصور حلاج کے متعلق مولانا روم کا نقطۂ نظر پیش کرکے ان کے نعرۂ انا الحق اور فرعون کے دعوئے ربوبیت کا فرق دکھایا گیا ہے، اس میں منصور کے پھانسی دیئے جانے کے بعض خاص اسباب کا ذکر بھی ہے، یہ رسالہ ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں شائع ہوا ہے، ان کا نام ہی اس کی بلندپایگی کا ثبوت ہے، ان کے قلم سے بھی ایک

عالمانہ مضمون "خط بہار" شامل ہے، ڈاکٹر محمد باقر کا انگریزی مضمون بھی محققانہ ہے، اس مجلہ کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس کا دائرہ اردو ادب کی تحقیق تک ہی محدود نہ ہوگا بلکہ دوسری مشرقی زبانوں اور علوم تک وسیع ہوگا، امید کہ اس مجلہ کا خیر مقدم علمی حلقہ میں کیا جائے گا،

انداز:- مرتبہ۔ جناب علی احمد صاحب فاطمی، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت بہتر، صفحات مقرر نہیں، قیمت سالانہ ۵ روپے، پتہ انجمن تہذیب نو پبلیکیشنز ڈویژن ۲، ۲ چک الہ آباد،

یہ دو ماہی رسالہ الہ آباد کے چند نوجوانوں کی کوششوں سے ڈاکٹر سید محمد عقیل (شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی) کی نگرانی میں ۱۹۷۰ء کی آخری ششماہی سے جاری ہوا ہے، اس کا زیادہ حصہ کتابوں پر ریویو کے لیے وقف ہوتا ہے، لیکن بعض ادبی مضامین اور افسانے بھی شائع ہوتے ہیں، اس کا رجحان جدیدیت کے بجائے ترقی پسند تحریک کی جانب ہے، اس کی اشاعت کا خاص مقصد ہر مکتبہ فکر کی معیاری اردو کتابوں پر تبصرہ بتایا گیا ہے، لیکن اس کا دائرہ صرف شعری اور افسانوی مجموعوں تک محدود کر دیا گیا ہے، یہ نامناسب ہے، اس کا آٹھواں شمارہ سہیل نمبر ہے، اس میں مشہور ترقی پسند ادیب و افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی مرحوم کے متعلق بعض مضامین، ان کی کتابوں پر تبصرے اور ان کے خطوط وغیرہ شائع کئے گئے ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ دلچسپ ہوتا ہے،

الرسالہ:- مرتبہ۔ محمد نسیب کاغذ عمدہ طباعت ٹائپ بڑا سائز، صفحات ۴۰، قیمت سالانہ الجزائر میں ۱۰ ڈالر، دوسرے ملکوں سے اسی کے برابر۔ پتہ ۱۲ شارع علی بومنجل، الجزائر،

یہ ایک اصلاحی، دعوتی اور دینی رسالہ ہے، جو اسی سال مارچ سے الجزائر کے دینی امور کی وزارت کی جانب سے عربی میں شائع ہوتا ہے، اس کے مضامین میں مسلمانوں کو ایمان اور صحیح عقائد اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، اور موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے اسلام کے بارہ میں جو شبہات پیدا کر دئے ہیں، ان کا جواب بھی دیا جاتا ہے، آخر میں حکمت و ظرافت کی

مفید اور دلچسپ باتیں اور شعر و ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے،

دار الاسلام:- مرتبہ۔ مولانا بدر القادری، کاغذ عمدہ کتابت و طباعت بہتر تقطیع خورد، صفحات ۴۰ قیمت تحریر نہیں، پتہ۔ نیدرلینڈ اسلامک سوسائٹی کو دے نارڈ ۰۰ ایمسٹرڈم ہالینڈ

یہ نیا اردو ماہنامہ جون ۱۹۷۰ء میں ہالینڈ سے شائع ہوا ہے، جولائی کا شمارہ اصلاحی مضامین پر مشتمل ہے، ایک مضمون میں باطنیوں کے فرقہ نصیریہ کے متعلق معلومات درج ہیں، یہ المجتمع کویت سے ماخوذ ہے، ایک مضمون میں بیت المقدس کی بازیابی کے لیے مسلمانوں کو سرگرم ہو جانے کی دعوت دی گئی ہے، رسالہ مفید ہے، مگر خطیبانہ انداز اور لفاظی سے پرہیز کرنے اور فرقہ و مسلک کے اختلاف سے بالاتر ہو کر صرف اسلام کی خدمت و اشاعت کو نصب العین بنانے کی ضرورت ہے۔

عبارت:- مرتبہ۔ جناب رئیس نعمانی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت معمولی چھوٹا سائز، صفحات۔ ۳۲ قیمت سالانہ دس روپیہ۔ پتہ پرشین اکاڈمی ۱۹۱ اصطبل چارباغ، لکھنؤ،

جناب رئیس نعمانی کی تحریری سرگرمیوں کا میدان فارسی زبان ہے، ان کے مجموعہ کلام "براتِ معنی" کا معارف میں پہلے ذکر ہو چکا ہے، اب انھوں نے یہ ماہنامہ جاری کیا ہے، جس کا پہلا شمارہ جولائی میں شائع ہوا تھا، لیکن ہمیں تاخیر سے ملا، یہ اچھے مضامین پر مشتمل ہے، خصوصاً سبک اقبال (ڈاکٹر سید عبد اللہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) اور مسائل تدریس فارسی (ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں، منظومات کا حصہ بھی فروتر نہیں ہے، اردو کی کسمپرسی کے اس دور میں فارسی کی پرسش اور پذیرائی کون کرے گا؟ رئیس صاحب کی یہ جرأت رندانہ بہرحال قابل تحسین ہے،

"ض"

مطبوعات جدیدہ

عربی میں نعتیہ کلام:- مرتبہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت
عمدہ، صفحات ۲۹۰، مجلد، قیمت ۳۰ روپیہ۔ پتہ:- میزان ادب ۱۲ بہادر شاہ مارکیٹ بچی روڈ کراچی پاکستان

شعراء نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے اپنی عقیدت و محبت اور فدویت
وجاں نثاری کے اظہار کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے اردو میں اس کا اصطلاحی نام نعت ہے اس سے دنیا کی ہر زبان
کی طرح خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بول چال کی زبان عربی کا ذخیرہ بھی خالی نہیں ہے گو اس میں اس
صنف کلام کے مجموعے کم مرتب کئے گئے ہیں، زیر نظر کتاب کا مقصد اردو خوان طبقہ کو عربی کی نعتیہ شاعری کے
انداز بیان اور خصوصیات سے واقف کرانا ہے، اس کے لائق مرتب ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پھلواری کے
اس علمی و دینی گھرانے کے فرد ہیں جو کئی پشتوں سے علم و عرفان کا گہوارہ رہا ہے اور اب مکہ معظمہ میں علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں
مشغول ہیں اس لیے عشق و محبت نبوی میں سرشاری و وارفتگی کی دولت ان کے خمیر میں ہے اور وہ اردو و عربی پر یکساں
قدرت رکھتے ہیں اس بنا پر یہ کتاب خوش ذوقی اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے، اشعار کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ اور
ان کی ایسی دلنشین تشریح کی ہے جس سے کلام کی بلاغت و لطافت اور ادبی خوبیاں بھی سامنے آگئی ہیں پہلے تقریباً
.. صفحے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور خیر و برکت میں کہے گئے نعتیہ کلام کو مع تبصرہ پیش کیا گیا ہے
پھر عباسی عہد اور اس کے بعد کے ممتاز و غیر ممتاز نعت گو شعرا کا کلام درج ہے، ہندوستان کے حضرت شاہ ولی اللہ، شیخ
احمد تھانیسری اور آزاد بلگرامی کے نعتیہ کلام کا بھی نمونہ دیا ہے، آخر میں اس عہد کے ممتاز مصری شاعر احمد شوقی کی
نعتوں کا بھی انتخاب ہے، شروع میں عربی نعت گوئی کی مختصر تاریخ، اس کے خاص اجزاء و عناصر اور اس میں بیان

کئے گئے اہم مضامین کی وضاحت ہے اور آخر میں حق بحقدار رسید کے زیر عنوان چند ایسے اشعار درج
ہیں جو گو رسول اللہ کی مدح و منقبت میں نہیں کہے گئے ہیں لیکن ان کی اصل مستحق اور خاص مصداق آپ
ہی کی ذات مبارک ہے، مفہوم کی وضاحت کے لئے لغات و شروح کی کتابوں کے علاوہ احادیث سے بھی مدد
لی ہے، اور اشعار کے ہم معنی اردو و فارسی اشعار بھی نقل کئے ہیں، کہیں کہیں عام شارحین کے بیان کردہ مفہوم
سے بے اطمینانی ظاہر کی گئی ہے، غلط روایتوں کی تردید پر بھی توجہ کی ہے اور مستشرقین نے جن واقعات کو رنگ
آمیزی دیکر کچھ سے کچھ بنا دیا ہے ان کی حقیقت بھی ظاہر کی ہے، جن قصائد کی شرحیں اور تضمینات لکھی گئی ہیں
ان کا ذکر بھی آگیا ہے، مصنف کے نقد و نظر کا کمال وہاں ظاہر ہوتا ہے جہاں انھوں نے الحاقی اشعار پر
بحث و گفتگو کی ہے، بعض معروف نعتیہ کلام [illegible] کے انتخاب میں اس لیے نہیں آسکا کہ وہ منحول تھا اس معاملہ
میں انھوں نے اپنے مخدوم و مربی اور علمی مرشد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی ایک جگہ اختلاف کیا ہے،
مولانا نے حضرت حسانؓ کی نسبت سے دو اشعار نقل کئے ہیں (ص ۱۰)، مصنف کے نزدیک ان کی نسبت حضرت حسانؓ
کی جانب مشکوک ہے (ص ۴۲) گو مصنف نے بعض شعراء کے مختصر حالات بقدر ضرورت تحریر کیے ہیں لیکن اگر وہ اسیطرح
سب شعراء کے مختصر حالات بھی تحریر کر دیتے تو اس کتاب کا فائدہ اور بڑھ جاتا، مراجع کے زیر عنوان بھی بعض مصنفین کے
سنین وفات درج ہیں، مگر بعض کے نہیں ص ۲۹۴ پر علامہ ابن عبد البر کا نام دو جگہ تحریر ہے پہلی جگہ ان کا سنہ
وفات ۴۶۲ھ اور دوسری جگہ ۴۶۳ھ دیا گیا ہے، یہ تضاد کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہوگا، لیکن محقق
قول کے مطابق ان کی وفات ۴۶۳ھ میں ہوئی تھی مصنف نے اعتراف کیا ہے اس کتاب کا
مقصد عربی کی نعتیہ شاعری کا استیعاب نہیں ہے تاہم اس سے عربی شعر و ادب [illegible] ان کی دلچسپی کے علاوہ اُس
قلبی کیفیت کا پتہ بھی چلتا ہے، جو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے، شروع میں مولانا سید
ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی موثر اور ان کے ادب و انشاء کا دلکش نمونہ ہے، یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے
جو ترمیم و اضافہ کے بعد اہتمام سے شائع کیا گیا ہے،

جریر، شخصیت اور شاعری: مرتبہ ڈاکٹر عبد الباری، تقطیع خورد، کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی صفحات ۲۰۰ مجلد مع گردپوش قیمت ۱۲ روپیے پتہ ڈاکٹر عبد الباری، دار الانس، دودھ پور، علی گڑھ،

زیر نظر کتاب میں اموی دور کے ممتاز شاعر جریر کی شخصیت اور شاعری پر بحث کی گئی ہے، اس میں جریر کی شخصیت کے خط و خال اس کے عہد، ماحول اور شاعری کی روشنی میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلہ میں اس کے گھرانے، بادیہ نشینی سے دربار شاہی تک رسائی، اور اس کے اخلاق و عادات کا مرقع پیش کیا ہے اور اسکی شاعری میں مذہبی اثرات اور جدت طبع کے نمونے پیش کئے ہیں پھر ان اصناف کلام پر بحث کی ہے جن میں جریر نے طبع آزمائی کی تھی جیسے ہجو، قصیدہ، مرثیہ اور غزل وغیرہ اس ضمن میں جریر کے پیش رو شعراء کے علاوہ اسکے معاصرین فرزدق و اخطل وغیرہ سے مقابلہ کرکے اس کی عظمت و برتری دکھائی ہے، مستشرقین اور ان مسلمان مورخین اور ادیبوں کی تردید بھی کی گئی ہے جو اموی دور کی شاعری کو جاہلی دور کی شاعری سے پست اور اس کی غلامانہ تقلید کا نتیجہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اسلامی عہد کے اثرات و فتوحات کے ذکر سے خالی اور اپنے زمانہ کی تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے، لیکن مصنف کے بعض خیالات درست معلوم نہیں ہوتے کیونکہ یہ صحیح ہے کہ جاہلی دور کی شاعری سے اموی دور کی شاعری فروتر ہے، اور اس میں پوری طرح اسلامی اثرات کا ذکر نہیں ہے، محض چند اشعار اسکی دلیل نہیں ہو سکتے کہ جریر اسلامی افکار و تصورات کا ترجمان تھا، کتاب میں جریر کے عام حالات بھی بیان نہیں کئے گئے ہیں کتابت و طباعت کی غلطیوں کے علاوہ کہیں کہیں زبان و طرز ادا کی بھی خامیاں ہیں جیسے جریر کی شاعری کا جون سا رخ ہو (ص ۵۹) اس سیاسی نزاع کے اثنا مذکورہ دونوں گھرانوں کے ..... (ص ۱۰۶)، عربی ادب کے مشہور عباسی ناقد و راوی ابو عبیدہ ..... (ص ۱۳۰)، مزار کا لفظ مذکر ہے، مصنف نے اسکو مونث لکھا ہے (ص ۱۶۷) ص ۱۵۳ پر متمم بن نویرہ کے مرثیہ کے دو شعر کے اس ترجمہ میں بھی غلطی ہو گئی ہے "کیا مقام لوی اور کادک کے درمیان بنی مر اس قبر پر آنسو بہاؤ گے جس پر تمہاری نگاہ پڑے گی، صحیح ترجمہ اسطرح ہو گا کیا مقام لوی و کادک کے درمیان بنی ایک قبر کی وجہ سے تم ہر ہر قبر پر ..... اردو میں جریر پر کوئی مستقل کتاب نہیں تھی اس کتاب سے جریر کی شخصیت اور شاعری کے بعض پہلو سامنے آگئے ہیں۔

"ض"